

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

طلوع اسلام



ژوئہ ۱۹۳۹



ایک روپیہ



مکتب
محمدیوس

طلوع اسلام

بدل اشترام
سالانہ
ششماہی
فربہ ہر مہینہ
پچاس روپے
پچاس روپے
تین روپے

جلد ۲ کراچی فروری ۱۹۲۹ء نمبر ۲

فہرست

۸-۱	۱	لمعات
۷۵	۲	بقیہ لمعات
۲	۳	۱) استصواب کشمیر
.....	۴	ب) انتخابات پنجاب
۹	۵	تعلیمات اقبال
۱۴	۶	حکومت اور مملکت
۱۸	۷	باب المراسلات
.....	۸	اسلامی جماعت
۲۳	۹	پاکستان مسلم لیگ
۳۳	۱۰	معارف القرآن
۴۶	۱۱	اسلام کا نظریہ جہاد
۵۶	۱۲	تجارت (نظم)
۵۷	۱۳	یہ ہندوستان ہے
۶۳	۱۴	باری رپورٹ سندھ
.....	۱۵	بقیہ لمعات

معاہدہ

استصواب کشمیر

حفاظتی کونسل نے ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء کو ایک قرارداد کی رو سے پانچ ارکان پر مشتمل کمیشن کی تشکیل کا اعلان کیا جو پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو کشمیر میں جنگ بند کرنے اور استصواب کے لئے تیاری کرنے پر آمادہ کرے۔ دونوں حکومتوں سے مذاکرات کے بعد کشمیر کمیشن نے سہراگست کی قرارداد پیش کی جو ستمبر میں اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ قرارداد تین حصوں میں منقسم تھی۔ پہلا حصہ التوائے جنگ سے متعلق تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں یہ تجاویز منظور کرتے ہی باہمی طور پر کوئی تاریخ مقرر کریں اور بروقت احکام صادر کریں تاکہ تمام افواج مقررہ تاریخ کو لڑائی کی قلم بند کریں۔ اس کے بعد جانیں کسی طرح افواج میں اضافہ نہ کریں۔ جانیں کی فوجی ہائی گمانیں افواج کے موجودہ مقامات تعین پر کوئی مقامی تبدیلی کرنا چاہیں تو باہمی مشاورت سے ایسا کر لیں۔ کمیشن حسب ضرورت و منشا عسکری سبھرن مقرر کرے گا تاکہ فیصلہ التوائے جنگ پر مکمل عمل درآمد کی نگہداشت ہو سکے۔

قرارداد کا دوسرا حصہ ستارک سے متعلق تھا۔ اس کی رو سے پاکستان کو ریاست کشمیر کی حدود سے اپنی جگہ افواج واپس بلا لینے پر رضامند ہونا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ ان قبائلیوں اور پاکستانیوں کو جو ریاست کشمیر میں بغرض جنگ موجود ہیں ریاست سے نکلوانے کی کوشش کرے۔ اس طرح جو علاقہ خالی ہوگا اس کے انتظام کے ذمہ دار مقامی حکام "زیر نگرانی کمیشن ہوں گے۔ جب پاکستان یہ کہے گا کہ محارب قبائلی اور پاکستانی ریاستی حدود سے نکل گئے ہیں اور پاکستانی افواج کا انخلا بھی ہو رہا ہے اس وقت ہندوستان کمیشن سے طے کئے ہوئے طریقے اور رفتار کے مطابق اپنی افواج کا مستند حصہ ریاست سے نکالنا شروع کرے گا۔ قطعی معاہدہ کی شرائط تسلیم ہو جانے تک حکومت ہندوستان التوائے جنگ کے وقت کے عسکری خطوط میں اسی قدر فوجیں رکھے گی جو مقامی حکام کو امن قائم رکھنے میں مدد دینے کیلئے ضروری ہوں۔ حکومت ہندوستان اس کی ضمانت ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی حکومت اعلان کرے گی کہ وہ امن و قانون نیز جملہ انسانی و سیاسی حقوق کی محافظ ہوگی۔

قرارداد کا تیسرا حصہ ریاست کے مستقبل سے متعلق تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ حکومت ہندوستان و پاکستان اس خواہش کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ باشندوں کی مشاورت کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں دونوں حکومتیں کمیشن سے مذاکرات پر تیار ہیں تاکہ ایسی منصفانہ و عادلانہ شرائط کا تعین ہو سکے جس سے باشندگان جموں و کشمیر کی آزادانہ رائے دہی کا انتظام ہو سکے۔

اس قرارداد کو ہندوستان نے اپنی توجیہوں کے ساتھ منظور کر لیا۔ یہ توجیہیں مندرجہ ذیل تھیں:

- (۱) کمیشن جموں اور کشمیر کے سارے علاقہ پر ہمارا جگہ کا اقتدار تسلیم کرے گا۔
- (۲) جب اندازہ ہو کہ پاکستان خالی کر دے گا تو اس کا انتظام و انصرام حکومت کے سپرد ہو جائے گا۔

- ۳، حکومت پاکستان کو استصواب کے انعقاد و انتظام نئی ریاست کے اندرونی امور میں کچھ دخل نہیں ہوگا۔
 ۴، کمیشن پوری طرح اعتراض کرے کہ ریاست کو بیرونی حلوں اور اندرونی بد نظمی سے بچانا اور ضروری ہے اور یہ ذمہ داری حکومت ہندوستان کی ہوگی۔

ان توجہوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان عادلانہ استصواب سے بہ لطافت اخیل پہلو تہی کر رہا تھا۔ ایک تو یوں ہی اس قرارداد میں استصواب کا ذکر نہیں تھا، لیکن ہندوستان حکومتی انتظام کے بہانہ سے آزاد نگہ اور پاکستان کو جموں اور کشمیر میں مکمل طور پر بے دخل کر کے اپنا تسلط قائم کرتا چاہتا تھا تاکہ جو کچھ وہ جنگ سے حاصل نہیں کر سکا اسے گفتگوئے مصالحت و مفاہمت سے حاصل کر لے۔

ہندوستان کے غلبہ و تسلط کے سایہ میں رائے شماری کا نتیجہ ظاہر ہے! قرارداد نے ہندوستان کو میت حد تک کشمیر میں برتری عطا کر دی تھی لیکن ہندوستان رہی یہی کسری پوری کر لینا چاہتا تھا۔

پاکستان شروع سے ہی اس کا داعی تھا کہ ریاست کا مستقبل باشندگان ریاست کے ہاتھ میں ہے مستقبل سے متعلق فیصلہ کا حق انھیں اور صرف انھیں حاصل ہے۔ کسی قسم کا فیصلہ خواہ وہ پاکستان کی طرف سے ہو، خواہ ہندوستان کی طرف سے، ان پر تسلط نہیں کرنا چاہئے۔ لہذا ایسی برامن فضا قائم ہونی چاہئے جس میں اہالیان ریاست بے خوفی اور آزادی سے اپنی رائے دیکھیں۔ اور یہ فیصلہ کریں کہ انھیں پاکستان سے الحاق منظور ہے یا ہندوستان سے۔ اس برحق داعی کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہندوستان، جو کہ فریق مقدم ہے، کا لانا اور ریاست پر قابض نہ ہو جائے، ورنہ آزاد استصواب کا تصور باطل ہو جائے گا۔ چنانچہ پاکستان نے کمیشن پر واضح کیا کہ اس کا قدم اول یہ ہونا چاہئے کہ جنگ کشمیر ملتوی ہو جائے اور ایسا پرامن ماحول پیدا ہو جائے کہ اس میں استصواب کے عملی پہلو کا تعین ہو سکے۔ یہ ایک منصفانہ اور سیدھا سادا مطالبہ تھا، لیکن کمیشن کی قرارداد میں معاملہ کی اس سادگی اور وضاحت کا اعتراف منقوہ تھا۔ ہندوستان کی توجہوں نے اسے اور ابھارا دیا۔ چنانچہ پاکستان نے کمیشن سے درخواست کی کہ وہ غیر مشروط التوائے جنگ کا فیصلہ کرے اور اس سے پیدا ہونے والی پرامن فضا میں استصواب کا اوقات نامہ تیار کیا جائے، اور اگر کمیشن، ایسا کرنے سے قاصر ہے تو چونکہ متارک اور مستقبل سے متعلق تصنیف لازم و ملزوم میں اس لئے اگر کمیشن متارک کی شرط یعنی قرارداد کا حصہ دوئم منظور کرنا ہے تو اسے چاہئے کہ قرارداد کے حصہ سوم متعلقہ مستقبل ریاست کی وضاحت کرے تاکہ استصواب کی اساسات متفرعام پر آجائیں۔ حکومت پاکستان نے قرارداد کو مکمل اور سہم قرار دیتے ہوئے اس عمومی شرط کے ساتھ اسے قبول کر لیا کہ حکومت ہندوستان مجلس تحفظ کی قرارداد ۱۱ اپریل ۱۹۴۹ء کی شرائط متعلقہ آزادانہ و منصفانہ استصواب ضرور منظور کر لے۔ حکومت ہندوستان کی بحولہ بالا توجہوں اور قرارداد کے ایہام کے پیش نظر عمومی شرط اٹھدنا گزیر تھی۔ حکومت پاکستان نے کمیشن کو سہم تجاویز کی تفصیل کیلئے بھی لکھا۔

ہندوستان کی توجہیں قرارداد کے سانی تھیں، لہذا ہندوستان کا یہ دعویٰ کہ اس نے قرارداد کو تسلیم کر لیا ہے، جہ بنیاد تھا۔ کمیشن اس لغظی قسلی کے بعد پرامن چلا گیا، کیونکہ توام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سلسلہ میں اس کی وہاں ضرورت

تھی۔ معاملہ بہر نوبت، حکومت ہائے پاکستان و ہندوستان اور کمیشن کے مابین زیر بحث رہا، تا آنکہ ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو کراچی اور نئی دہلی سے ایک ہی مضمون کے اعلیٰ سطح پر ہونے کے کثیر میں لڑائی ۳۱ دسمبر کی شب کو بارہ بج کر اسی گھنٹہ منٹ پر ختم ہو جائے گی۔ کمیشن نے یہ سال کو کا تحفظ اقوام متحدہ کی مجلس تحفظ کو پیش کیا۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ فی الواقعہ سال کو کا تحفظ تھا۔ کراچی کے متعدد دسترخمیز مذاہب جنگ سے کم از کم ایک محاذ پر سے تو اتوائے جنگ کی فزائی بالآخر جنوری کی تجاویز منصفہ شہود پر آئیں جو ۱۳ اگست کی قرارداد کا حصہ اور تشریح ہیں۔ ان تجاویز کا مضمون یہ تھا:

i) جنوں و کشمیر کا ہندوستان یا پاکستان سے اٹھائی آزادانہ استصواب کے جہوری طریق سے فیصلہ ہوگا۔
 ii) جب کمیشن کو اطمینان ہو جائیگا کہ ۱۳ اگست کی قرارداد کے حصص اول و دوم (اتوائے جنگ اور تارکہ) پر کیا حقہ عمل درآمد ہو گیا ہے اور استصواب کے استقامت مکمل ہو گئے ہیں، اس وقت استصواب برپا ہوگا۔
 iii) اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل کمیشن کی منظوری سے کسی ایسے اعلیٰ بین الاقوامی حیثیت رکھنے والے صاحب کونالیم استصواب نامزد کرے گا جسے عمومی اعتماد حاصل ہوگا۔ اس نامزد کارسی تقرر حکومت جنوں و کشمیر کرے گی۔
 iv) نامزد استصواب ریاست جنوں و کشمیر سے وہ اختیارات حاصل کرے گا جو آزادانہ استصواب کے لئے ضروری ہوں۔ اسے حسب ضرورت معاونین و ممبرین مقرر کرنے کے اختیارات ہوں گے۔

v) قرارداد ۱۳ اگست کے حصص اول و دوم پر عمل درآمد چکے کے بعد جب کمیشن کو اطمینان ہو جائیگا کہ حالات برقرار ہو گئے ہیں، تو کمیشن حکومت ہندوستان کے مشورے سے یہ طے کرے گا کہ آخر کار ریاستی اور ہندوستانی مسلح فوجوں کا کیا انجام ہو۔ یہ فیصلہ ریاستی حفاظت اور آزادی استصواب کے تقاضوں کے پیش نظر کیا جائیگا۔

آنا و کشمیر کی افواج کا انجام کمیشن، نامزد استصواب اور مقامی حکام کی مشاورت سے فیصلہ ہوگا۔ ہندوستان اور آزاد کشمیر کی افواج سے متعلق یہ آخری فیصلے اس وقت ہوں گے جبکہ اتوائے جنگ اور تارکہ پر عمل درآمد ہو چکا ہوگا۔ یعنی پاکستان کی ساری اور ہندوستان کی متحدہ فوجیں ریاست سے نکل چکی ہوں گی۔ یہ فیصلہ جانہین سے متعلق ہوگا اور اس کا اطلاق جانہین پر ہوگا۔ اس کے بعد ان تحفظات و مراعات کا ذکر ہے جو استصواب کے سلسلہ میں حاصل ہوں گے۔ مثلاً

i) جو لوگ ریاستی حدود میں ۱۵ اگست ۱۹۷۱ء کے بعد جائز ضروریات کے علاوہ آئے اور بدستور موجود ہیں، انہیں ریاست سے نکلنا پڑے گا۔

ii) سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

iii) اقلیتوں کا تحفظ ہوگا۔

iv) سیاسی حقوق کا تحفظ ہوگا۔ سیاسی پریجینڈس کی اجازت ہوگی۔ آمدورفت، تہذیب اور تقریب کی آزادی ہوگی، وغیرہ استصواب کے خاتمہ پر نامزد استصواب یہ تصدیق کرے گا کہ استصواب حسب خواہ آزادانہ ہو رہا ہے۔

حکومت پاکستان نے ۲۶ جنوری کو ایک اعلیٰ سطح پر ان تشریحات کو شائع کر دیا جو کمیشن نے ان تجاویز سے متعلق ہم پہنچائیں اور جن کی روشنی میں اور اس پر پاکستان نے ان تجاویز کو منظور کیا۔ اس حقیقت کو خصوصیت سے ملحوظ

رکھنا چاہئے کہ ۱۳ اگست اور ۱۴ جنوری کی قراردادیں اور کمیشن کی تشریحات مل کر ایک وحدت بنتی ہیں۔ یہ تجاویز کا خاکہ ان سب دستاویزات کو ملائے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ ان دستاویزات کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور نکھر کر سامنے آتے ہیں:-

۱) فیصلہ پیش نظر کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اتراٹے جنگ ہے، جس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ دونوں حکومتوں نے لڑائی بند کر دی ہے اور جانیبن کی فوجیں ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء رات کے بارہ بجکر اٹھ منٹ پر جہاں تھیں وہیں جا رہی ہیں۔ دونوں ممالک کی فوجیں ہائی کمانیں اپنی مشاورت کر رہی ہیں اور ضروری جزئیات طے ہو رہی ہیں۔

۲) دوسرا مرحلہ متارکہ ہے۔ اس سلسلہ میں کمیشن کا عسکری مشیر اور عسکری ممبرین غیر متبہد ہیں پہنچ رہے ہیں۔ ان کے آنے پر متارکہ کی وہ تعمیل طے ہوگی جن کے مفہوم میں ہنوز ابہام پایا جا رہا ہے۔ متارکہ کے حکمت میں سے یہ ہیں:-

ا) ریاست سے پاکستان کی تمام اور ہندوستان کی بیشتر افواج کا انخلا۔ یہ انخلا عام دہندوستانی خیال کے خلاف بیک وقت شروع ہوگا۔ یعنی یوں نہیں ہوگا کہ پہلے پاکستان اپنی فوجیں نکال لے اس کے بعد ہندوستان ایسا اقدام کرے۔ جو ہندوستانی فوجیں ریاست میں رہ جائیں گی ان کے متعلق کمیشن نے ضمانت دی ہے کہ وہ کم سے کم ہوں گی۔

ب) جو علاقے اس وقت پاکستان کے فوجی تصرف میں ہیں وہ آزاد کشمیر کی فوجی تحویل میں چلے جائیں گے آزاد کشمیر کی فوجیں بدستور باقی رہیں گی۔ ان کو غیر مسلح اور منتشر نہیں کر دیا جائے گا۔

ج) پاکستان ان محارب قبائلیوں اور پاکستانیوں کو جو ریاست کے باشندے ہیں، ریاست سے نکلانے میں اسکا فی کوشش کرے گا۔

د) کمیشن نے جہاں مقامی حکام کی ترکیب استعمال کی ہے، اس سے مراد آزاد کشمیر حکومت ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کا نام اس لئے نہیں لیا گیا کہ کمیشن نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستانی افواج جن علاقوں کو خالی کرینگی ان کا نظم و نسق آزاد کشمیر حکومت کے سپرد ہوگا۔ کمیشن اس پر نگران ہوگا۔ یہ نگرانی اتحتی کے مرادف نہیں ہوگی۔ کمیشن صرف اس کی نگرانی کرے گا کہ متارکہ کی پابندی ہوتی ہے۔ گویا آزاد کشمیر حکومت ان علاقوں میں جو اس کے قبضے میں ہیں نیز ان علاقوں میں جو پاکستانی افواج کے انخلا سے اس کی تحویل میں آجائیں گی پوری طرح آزاد ہوگی۔ جھگڑت میں اس نگرانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہاں پاکستان کا پولیس ایجنٹ مقیم و متعین ہے۔ آزاد کشمیر کے علاقوں میں جہاں جسکی حکومت کا مطلقاً کوئی اثر و نفوذ نہیں ہوگا، اس سے یہ اجازت ہوگی کہ وہ اپنے نائب (فوجی یا غیر فوجی) ان علاقوں میں بھیجے۔

س) ریاست کے ہندوستانی اور آزاد کشمیری علاقوں میں امن و قانون بحال رہیں گے اور جلد سیاسی حقوق کا تحفظ ہوگا۔

۳) تیسرا مرحلہ استصواب ہے۔ جس کی اساسات درج ذیل ہیں:

۱) استصواب ریاست جموں و کشمیر کا فیصلہ ہے حیثیت ایک وحدت کے کرکھا، یعنی استصواب کے فیصلہ کا

اطلاق پوری کی بھرکا ریاست پر ہوگا۔ بالفاظ صحیح تر ریاست کی تقسیم خارج از بحث ہے۔
 ب) استصواب کا انتظام و انصرام ناظم کرے گا جسے اقوام متحدہ کا سکرٹری جنرل کمیشن کے
 مشورہ سے نامزد کرے گا۔ اس نامزدگی میں حکومت اپنے ہندوستان و پاکستان سے مشورہ ضرور
 کیا جائے گا لیکن آخری فیصلہ سکرٹری جنرل کمیشن کے مشورہ سے کرے گا۔ ناظم کارسی تقسیم
 ریاست کی طرف سے ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ناظم ریاست کے ماتحت ہوگا۔ وہ اعلیٰ
 بین الاقوامی حیثیت کا مالک ہوگا اور اسے عمومی اعتماد حاصل ہوگا۔

استصواب کے انعقاد و انتظام کے سلسلہ میں ناظم جو اختیارات رسمی طور پر ریاست کے
 حامل کرچکا وہ (ریاست اور ہندوستان کے لئے) ایک لفظ تالی ہے۔ ناظم جن اختیارات کو آزادانہ
 استصواب کے لئے ضروری سمجھے گا وہ اسے "حامل" ہو جائیں گے۔ اس "حصول" میں اجازت و اعطا
 کا سوال نہیں۔ استصواب کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری تنہا ناظم کی ہوگی۔

ج) ناظم استصواب کی نامزدگی کمیشن کی تجاویز منظور ہوجانے کے بعد جتنا جلدی ممکن ہوا
 کر دی جائیں گی۔ اس تقرر کے جتنا جلدی بعد ممکن ہوا، ناظم مسئلہ زیر بحث کا معائنہ اور مطلوب
 عمل کی بھرتی شروع کر دے گا۔

د) استصوابی تجاویز کو اسی وقت زیر غور لایا جائے گا جبکہ کمیشن کو اطمینان ہو جائے گا کہ تارک
 پر حسب خواہ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

س) ناظم کارسی تقرر اور اس کی کارروائی اس وقت شروع ہوگی جب کمیشن کو اطمینان ہو جائے
 کہ ۱۳ اگست کی قرارداد کے حصص اول و دوم پر عمل درآمد مکمل ہو چکا ہے۔
 (س) باقاعدہ رائے شماری اس وقت ہوگی جبکہ جلد انتظامات استصواب مکمل ہو جائیں گے۔

بدقسمت ریاست کشمیر (دہجوں) اور اس کے بدقسمت تر باشندوں کے لئے مہاراجہ کشمیر کے الحاق
 ہندوستان کا فراقا شاخہ قدم برق چلاکت ثابت ہوا۔ کشمیری مسلمان جو نسلًا بعد نسل استبداد ملوکیت کے گرا بنا
 اطواق و سلاسل کے نیچے دبے چلے آ رہے تھے اور جن کی چھینیں مہاراجہ کی عشرت گاہوں کے نقارخانے میں طوطی
 کی آواز سے زیادہ دقیق نہیں تھیں مرگ بے پناہ کا نشاد ہی نہیں بنے بلکہ ان کی عزت و آبرو بھی خاک میں مل گئی۔
 راجپوت سیکو سنگھ اور سکھ درندوں نے ہندوستانی فوج کے ایلیسی سائیے میں وہ بے پناہ مقام توڑے کہ جس میں
 انسانیت عرق آلود ہے۔ ہالینڈ کے انڈونیشی اقدام چلہ حاد کے خلاف دہائی دینے والے نہرو کی فوجوں نے
 کشمیر کی جنت نظیر سرزمین میں انسانی جان آبرو کو اس بے رحمی سے خاک میں ملایا کہ اس کا ہونہ مطاعن ہالینڈ
 ہی شاید اس سے سبق کیسے۔ کشمیریوں کو بے دردی اور غایت سفاکی سے تہ تیغ کیا گیا اور علاقوں کے علاقے

خالی کر لئے گئے اور فلاکت زدہ متلع بردہ کشمیریوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا تاکہ پناہ گزینوں کے اس نئے سیلاب میں پاکستان بھی بہ جائے۔ بقیۃ السیف مسلمانان کشمیر کثیر تعداد میں اس وقت پاکستان کی پناہ گاہوں میں پڑے ہیں، اور ان کے علاقوں میں ہندو اور سکھ آباد کر دئے گئے ہیں تاکہ اگر فوجی کارروائی ناکام ثابت ہو اور کسی وقت معاملہ استصواب پر ہی آئے رنگے تو ہندوستان کے پاس ہندوستان سے برآمد کئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کے ووٹ تیار رہیں۔ لیکن نصفانہ استصواب کے لئے ضروری ہے کہ پناہ گزینوں کو پھر سے اپنے آبائی علاقوں میں آباد کر لیا جائے اور انھیں موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آبائی وطن کے مستقبل سے متعلق رائے دہی میں شریک ہو سکیں۔ اس مسئلہ کا حل آسان نہیں۔ کیونکہ اول تو بہت سے مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں، دوسرے جو بقیۃ السیف پاکستان تک پہنچ سکے ہیں، انھیں انتہائی مجبوری کے عالم میں غیر انسانی مظالم سے تنگ آ کر ترک وطن کرنا پڑا ہے۔ وہ لفظی ضمانتوں اور تسلیوں سے واپسی پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ان کے لئے حقیقی امن کی ضرورت ہے۔ وہ جب تک پوری طرح محفوظ نہیں ہوں گے، واپس نہیں جائیں گے۔ اس معاملہ کا یہ نفسیاتی پہلو قرار دادوں سے حل نہیں ہو سکتا۔ وہ تارکین وطن جو ان علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جناب ہندوستان اور مہاراجہ کے زیر اقتدار ہیں گئے۔ ان علاقوں سے نکالے ہوئے مظلومین کی واپسی کیلئے غیر معمولی تحفظات کی ضرورت ہوگی آزاد علاقہ کے تھوڑے بہت لوگ آسانی سے واپس چلے جائیں گے لیکن ہندوستانی علاقے میں قدم رکھنے سے پیشتر وہ ہزار مرتبہ سوچیں گے۔ اور پھر یہ معاملہ محض ان کو متعلقہ علاقوں میں واپس بسمجدینے سے ہی ختم نہیں ہو جائے گا۔ ان کی بجالی اور آباد کاری کی ضرورت واپسی سے بھی اشد ہوگی۔ بیشتر پناہ گزین ایسے ہیں جن کے گھربارٹ بچے ہیں۔ وہ ویرانوں میں جا کر نہیں رہ سکتے۔ ان کے ابتدائی انسانی حقوق کا تحفظ از بسکہ لازمی ہے۔ ڈوگرہ راج میں انسانیت کی جو تہلیل ہوئی اس کے پیش نظر ریاست میں انسانی حقوق کا ذکر یہ عمل نظر آتا ہے، لیکن اب جبکہ اقوام متحدہ داخل ہو رہی ہے تو اسے ایسی فضائیں پیدا کرنی ہوگی جس میں انسانی حقوق کا احترام و تحفظ ہو سکے۔

ان پناہ گزینوں کی واپسی کے ساتھ ساتھ ان خارجیوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے جو جائز ضروریات کے علاوہ کشمیر پر مسلط کر دیئے گئے۔ پاکستانی علاقے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مظلوم کشمیریوں کی امداد کو باہر سے پہنچے۔ لیکن ہندوستانی علاقے میں وہ لوگ بھی ہیں جو ووٹ دینے کے لئے ریاست میں آباد کر دیئے گئے۔ ان کی تلاش اصناف کا اخراج ایک اور شکل پیدا کر دے گا۔ تصنیہ کرتے وقت آبادی کے اس داخل و خارج کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان سے وہ شرارتچی بھی آئیں گے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیر چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے!

کمیشن نے اس ضمن میں فیصلہ کیا ہے کہ کوئی ایسا شخص ریاست میں نہ رہے جو ہمارا گت مسئلہ کے بعد کسی جائز قانونی ضرورت کے علاوہ ریاست میں داخل ہوا۔ پناہ گزینوں کی واپسی کے لئے کمیشن نے

ہندوستانی اور پاکستانی علاقوں کے لئے علیحدہ کمیشن مقرر کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کی ترکیب اور کارگزاری باہمی مشاورت سے طے ہوگی۔

ان تجاویز کا تعاقب ان تجاویز سے کیا جائے جو ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو کمیشن نے پیش کیں تو معلوم ہوگا کہ ۵ جنوری کی تجاویز کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنا دیا گیا ہے۔

قرارداد اگست ۱۹۴۷ء میں بھی تھی اور اس اہل سے تعلق خاموش تھی جس کی بنا پر ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء کی قرارداد کی رو سے کشمیر کمیشن معرض وجود میں آیا تھا۔ کمیشن کو یہ فریضہ تفویض کیا گیا تھا کہ وہ جنگ بند کرے اور استصواب کے لئے فتنہ سازگار کرے۔ کمیشن نے جنگ بند کرانے کا تو ذکر کر دیا لیکن استصواب کو نظر انداز کر دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دونوں حکومتیں قرارداد اگست کو منظور کھیں تو استصواب کا مسئلہ خود بخود سامنے آجاتا، لیکن یہ عین ممکن تھا کہ ایسا نہ ہوتا، کیونکہ ہندوستان استصواب کے حق میں نہیں تھا اور وہ جیلوں بہانوں سے اسے ٹال رہا تھا۔ اس خدشہ کو مزید تعویت خود ان یادداشتوں نے بہم پہنچائی جو ڈاکٹر لوزانو اور مشر نہرو کے مابین ملاقاتوں سے متعلق ہیں اور جنہیں حکومت ہندوستان نے قبل از وقت اور بلا رضامندی کمیشن و پاکستان شائع کر دیا۔ ان یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وزیر اعظم ہندوستان نے انتہائی زور لگایا کہ استصواب برہانہ ہو، بلکہ کوئی تبادل صورت اختیار کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کمیشن کی استصواب سے تعلق خاموشی اسی دباؤ کا نتیجہ یا اس کے احترام میں ہو۔

مظلومین کشمیر جنہیں انگریزوں نے رسوائے عالم معاہدہ امرتسر کی رو سے ڈوگریوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا ایک سو سال سے ڈوگری سنگینوں کے سائے میں دم توڑ رہے تھے۔ انہوں نے اس ذلت کی زندگی سے بچنے کی کوشش بھی کیں، لیکن وہ ڈوگریوں کا بوس سے رہائی حاصل نہ کر سکے۔ قیام پاکستان سے ان کے خاکسیر جات کو پھر سے برا فر دخت کیا۔ جلتے مرنے والوں کی خاکسیر صرف تعمیر سحر آزادی ہونے لگی۔ ہندوستان، مظلوموں سے ہمدردی کا دم بھرنے والا نہرو، مہاراجہ کشمیر کے خلاف جنگ آزادی لڑنے والوں کا پشتیبان نہرو، کیل کانٹے سے لیس ہو کر ظالم اور مستبد مہاراجہ کی دعوت پر کشمیر آپہنچا اور جنت نظر کشمیر کو، جہنم زار بنا کے رکھ دیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ دونوں میں سرزمین کشمیر سے نخل آزادی کا کلی استعمال کر کے غلامی کا بیج ہمیشہ ہیشہ کے لئے بوجایا گیا۔ لیکن آزادی کا ایڈتاسیلاب جو تھا مہاراجہ سے نہ تم سکا تھا، وہ مہاراجہ اور نہرو کی ملی بھگت سے بھی نہ تم سکا۔ مورچ آب بڑے کے دریائے سندھ تیز ہو گئی اور مہاراجہ اور نہرو دونوں خس و خاشاک کی طرح بہتے نظر آئے۔ دونوں کی آنکھیں بالآخر کھلیں، اور انہیں یقین ہو گیا کہ کشمیری مسلمان ریگنٹا کیر انہیں بلکہ پیل ٹرنڈ سے۔ ناچار ایک سکسٹیس اور سپرس کے طواف شروع ہو گئے کہ کہیں سے وہ نکلے گیما۔ میسر آئے کہ ان کی درندہ فوجیں مسن خام سے کندن بن جائیں۔ بقلا ہر حق کی نفع نظر آرہی ہے اور باطل ظالم و فاسق نظر آ رہا ہے۔

لیکن ہمیں خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ فلسطین کا مسئلہ مجلس تحفظ کے ہاتھوں ڈوبا، حیدرآباد کا مسئلہ اسی مجلس کے روبرو پیش ہے اور اس کے ایجنڈے سے خارج نہیں ہوا۔ انڈونیشیا میں دیکھتے دیکھتے ہالینڈ نے اندھیر مجا دیا اور حریت و آزادی کی شمعیں ایک ایک کر کے گل کر دیں اور مجلس تحفظ اسی شب تار کو صبح روشن سمجھ رہی ہے۔ خود اپنے ہاں ریڈ کلف کی ہلک مثال موجود ہے۔ ایک غیر جانبدار اور معتدل علیہ کو قوموں کی قسمت سونپی گئی اور وہ شقی القلب لاکھوں کے محض قتل پر دستخط کر کے یہاں سے رخصت ہو گیا۔ ریڈ کلف کے معاملے میں پاکستان نے خطرناک ترین غلطی کا ارتکاب کیا۔ اگر ریڈ کلف کو یوں کھلی جھٹی نہ دے دی جاتی اور اس کی فرعونہ دیانت سے متعلق ہم نے علی وجہ البصیرت فیصلہ کیا سہتا تو آج کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ صرف ایک گورنر اسپور کا ضلع جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جو حق و انصاف اور آئین و قانون کے جملہ اصولوں کے مطابق مسلمانوں کے ہی حصہ میں آنا چاہئے تھا، مسلمانوں کے حصہ میں آجاتا تو کشمیر کے ہندوستانی دروازے کلیتہً مسدود ہو جاتے اور ہندوستانی اور ڈوگرہ درندے خوفناک ہلاکت نہ پھیلا سکتے۔ اب پھر ہم ایسے ہی مقام پر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ذرا سی غفلت ہماری ہلاکت کا باعث ہو جائے۔ ریڈ کلف کے بھر پور وار سے تو ہم ایک حد تک جانبر ہو گئے ہیں لیکن اگر خدا نخواستہ ایسا ایک اور ریڈ کلف ہمارے نصیب میں آگیا تو پاکستان ختم ہو چکا ہوگا۔

ہندوستان کی نیت صاف نہیں۔ اس کے عزائم غیر مشتبہ ہیں۔ وہ کشمیر کو حتی الوسع ہاتھ سے جانے نہیں دیگا۔ حق و انصاف اور آئین و جمہوریت کی رو سے کشمیر پاکستان اور صرف پاکستان میں جاسکتا ہے۔ لیکن دہلی حق و انصاف کا گہوارہ نہیں، نہ آئین و جمہوریت کا سوزوں مسکن۔ ہندوستان دھوکہ اور سیاسی قزاقی سے کشمیر کو ہتھیانگا۔ نہرو، پٹیل، آئننگر، عبدالنہر بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے اور ہندوستان ہی سے اسحاق کرے گا۔ وہ استصواب کو غیر ضروری اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا نتیجہ جانتے ہیں۔ انہیں اپنے الزام کا پتہ یقین ہے۔ لہذا وہ خلوص اور دیانت سے پہلو تہی کریں گے۔ خلوص اور دیانت کا نتیجہ ان کے خلاف جائے گا۔

اترائے جنگ کے فیصلے سے پیشتر ہندوستان نے اس عہد کے باوجود کہ وہ کشمیر میں جنگ تیز نہیں کریگا اور حالات کو اور گہرنے سے روکیگا، اس نے بھاری سٹلے کئے اور بڑے علاقے اپنے قبضہ میں کر لئے۔ برقیاری اس کی پسپائی کا پیغام لارہی تھی۔ اس کا اندرونی خلفشار اور بد نظمی اور سہمہ گیر عدم اطمینان اس پر مستزاد تھے۔ اس نے ستانے کا موقع ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کے نئے ہتھیارے ہوئے علاقے سردیوں میں اس کے پاس رہیں گے۔ بہار اور گوا میں؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اپنے قدم اور مستحکم کر لے اور کسی بہانے سے فیصلہ اتوائے جنگ کو بدل دے؟ ایک غیر شریف حریف سے یہ بعید نہیں۔ کشمیر ان کے لئے وقار کا سوال بن گیا ہے، انصاف آئین کا سوال نہیں رہا۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

تلمیحات اقبال

(قرآن کریم سے)

(یہ تقریر جناب برہنہ نے، محضدی کوثریو پاکستان کراچی سے نشر فرمائی۔ ہم اہل ذہن و
سے باقاعدہ اجازت لیکر اس کی اشاعت کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام)

کسی مفکر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات
ہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک اس اصل کی حقیقت معلوم نہ ہو جائے جس سے اس کے فکر کی شاخیں
سیوٹی ہیں، اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اکثر مفکرین اپنی اساس فکر کو
اس طرح غیر معین اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والوں کو اس اصل و اساس کے تعین
میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور ان کے ناقدین و شارحین کی تباہی و بربادی سے یہ عمدہ پھیرہ سے
بچیدہ رہتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے دبیر پر دوسے پڑ جاتے
ہیں کہ حقیقت نگاہوں سے یکسر گم ہو جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکرین کا پیغام سمجھتے ہیں، وہ ان کے ناقدین اور
شارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس باب میں علامہ اقبال کی ہستی منفرد نظر آتی ہے کہ انھوں
نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیے ہیں کہ اس میں کسی
ظن و تخمین اور قیاس و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ باری ہمہ اسے ہماری لذت نکالتے اور ذہن کو یازوق جس
کہ پیغام اقبال سے دلچسپی رکھنے والے گذشتہ دس برس سے اسی تحقیق و جستجو میں سرگرداں و حیران و حیرت سے ہیں کہ
علامہ اقبال کے فکر کے آخذ کھاتے اور انھوں نے کن کن افکار و خیالات سے متاثر ہو کر اپنا پیغام متعین کیا تھا۔
نہی قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی ان کے فکر کو کائنات کے فلسفہ کا سرچشمہ نہ سمجھتا ہے اور کوئی فلسفے کے
خیالات کا پرتو نہیں انھیں برگسٹان کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور ہمیں رنگل کا خوشہ ہیں۔ اور بہت نام ہیں جو یہ سوچتے
ہیں کہ جب انھوں نے خود واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان کی فکر کا ماخذ کیا ہے اور وہ کن مقالوں سے متاثر ہوئے ہیں،
تو پھر اس کا دلچسپے جا اور کاہش لا حاصل سے مقصود کیا ہے؟ اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ مرحوم نے مشرقی و مغربی
معلوم قدیمہ و جدیدہ کا باہر سے نظر مطالعہ کیا تھا اور چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اس لئے انھوں نے فلسفے

مغربی مفکرین کے افکار و تصورات پر گہری نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں کہ ان کے فکری اساس، ان مفکرین کے تصورات و نظریات پر تھی۔ ان کی فکری اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر تھی۔ جو مشرق سے متاثر ہوتی ہے نہ مغرب سے۔ وہ اس کی تائید و تشریح میں مشرق و مغرب کے خیالات و تصورات کو مستحاذ و پیش کرتے تھے لیکن وہ اسے ان کے قیاسات و مزعومات سے طوٹ نہیں ہونے دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو یہاں تا۔ کہتے تھے کہ جس مقام سے وہ بات کر رہے ہیں وہ حکمت و فلسفہ کی حد سے ماوراء ہے۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
 ورنے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں
 عصر حاضر کے علوم و فنون کے متعلق انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ان میں جو باتیں انہوں نے اس حقیقت کے مطابق پائی ہیں جس پر ان کے فکری اساس تھی، انہیں تائید دے لیا گیا ہے اور جو چیزیں خلاف حقیقت ہیں ان کے قریب کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

طسّم علم حاضرنا شکستم
 خدا داند کہ ما نشد براہیم
 رچودم دانہ و دانش گسستم
 پنا را چہ بے پروا نشستم

غور کیجئے۔ چچوشاں دور حاضر کی علم و حکمت کو آتشِ نرود و قرار سے رہا ہوا اس کے تعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنی فکر کی اساس اس علم و حکمت پر رکھی تھی، اس پر کتنا بڑا بہتان ہے۔ علوم جدید ہی نہیں، بلکہ علوم قدیمہ کے نظریات کے متعلق بھی ان کا یہی مسلک تھا۔ ان غلط نظریات زندگی اور تصورات حیات تو وہ "ملا و رسوغی" کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

بیا ساقی گیرداں ساگئیں را
 بیفشاں ہر دو گیتی آستیں را
 حقیقت را چہ رند سے فاشی کر دند
 اکلاکم ششاسد رمز دیں را

جدید و قدیم دونوں کے متعلق۔

فلسفی سے: بلا سے بہت غرض مجھ کو
 یہ دل کی موت و اندیش و نظر کا فساد

ابہ ہواں یہ پیدا ہوا ہے۔ جب کہ انہوں نے اپنی فکر کو نہیں سے مانگے ہوئے افکار و نظریات سے متاثر نہیں ہوا تو وہ کونسی حقیقت ثابت تھی جس پر اس فکری اساس تھی۔ بیسہ کہ میں نے شروع میں کہا ہے انہوں نے اسے ایسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کسی نئے نئے یا اوّل تعمیر کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ ان کا پیغام سب سے پہلے منضبط صورت میں، امر اور نوزیہ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا ہے جو ان کی سب سے پہلی تفسیر ہے۔ اس ثنوی کے آخر میں انہوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی بارگاہ میں ایک تہا پش کی ہے جو ان کے عشق کی تہنی ان کے آرزوں کی محو اور ان کی تہا زار کی مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں کہ

گردم آئیند بنے جو ہر است
 و ہر بخرم غیر قرآن مضر است

یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے تو اسے ختم کر دو، ورنہ تمہیں۔

پر وہ ناموس، شکر، پاک کن
ایں نیا، راز خاتم پاک کن
تو یہ کیا نہیں بنا۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پاک کن مرا
جن کی نگاہیں قلب اقبال پر ہیں وہ اس شدتِ احساس کا خوب اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انہوں نے
اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر دلا رکھی ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ

گرد آس بار قرآن سفینہ ام
باستاناں اگر حق گفتہ ام
اور اگر میرا پیغام، قرآن ہی کا ترجمان ہے تو

عرض کن پیشِ خدا کے عزوجل
عشق من کہ دہم آغوشِ عمل
میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے کہ اقبال
کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان کی نگاہیں کس آفتابِ حقیقت سے مستیز تھیں۔ میرے نزدیک اقبال کی عظمت و عقیدہ
اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھا یا قرآن سے سمجھایا، ان کی سب سے سادہ، براست
شکلہٴ حجاز سے سر ہمہ آگینوں میں آیا کرتی تھی اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ
نہ تا کہ بادِ غیم دور ساغرِ افکنم

اقبال کے پیغام کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں جہاں جہاں قرآن کا ذکر آتا ہے وہ کس جذب و شوق اور
کیونہ مستی سے جسوسے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن کیا ہے! وہ کہتے ہیں۔

تو ہی دانی کہ آئینِ تو چیت
زیر گردوں سہر تکین تو چیت
آن کتاب زنده سر آں حکیم
حکمتِ اولیٰ ز آل است و قدیم
نسخہٴ اسرارِ کلونین بیات
بے ثبات از قوتش گیر وثبات
حرف اور آریب نے تبدیل نے
آپ اش شرمندہٴ تادیل نے
نوع انسان را پیامِ آخریں
حائل اور رحمتہٴ للعالمین

اور کہتے۔

ناش گوریم آنچه درد دلِ مضر است
ایں کتابِ نیست بہرہ دیگر است
بندہٴ مومن ز آیاتِ خداست
عصا باؤنہ پیدہ درد آفاتِ اوست
چوں کہن گردو چلنے در برش
ہر زبان اندر بر او پوں قباست
می دہد قرآن جہانے دیگرش

یہ کہتا ہے کہ آپ کو ان کے فہم قرآن کے کسی مقام سے اختلاف ہو لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے فکر کی

اساس کچھ اور تھی۔ اب آپ یہ سوچئے کہ جس مفکر کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہو۔ نہیں! بلکہ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ میرے پیغام میں غیر قرآن ایک حرف بھی نہیں۔ اس کے پیغام سے قرآن کی تعلیمات پیش کرنا اس کے پورے کے پورے پیغام کو پیش کرنا ہوگا۔ تلخیص قرآنی کے معنی یہ ہیں کہ اگر علامہ اقبال اپنے کسی شعر میں قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ یا کلمہ لائے ہیں تو یہ بنا دیا جائے گا اس سے کس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی نظم، حضرت راہ کے ایک مصرع میں لکھا ہے۔

آبِئَاؤُنَّ نَحْمَدُكَ كَوْمَنْزِ آيَةِ ان الملوک

تو ان الملوک کی تلخیص سے اشارہ ہے سورہ نمل کی اس آیت مقدسہ کی طرف کہ قَالَتْ اِنَّ الْمَلُوکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعْرَاجَ اَهْلِهَا اَذْکٰٓةً۔ وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ۔ ملکہ سببانے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی (کو فتح کر کے اس) میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ اور وہاں کے صاحب عزت و وحشت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ اور کوئی ہنگامی چیز نہیں۔ بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، چونکہ اقبال کے پیغام کا ماخذ ہی قرآن ہے، اس لئے ان کی جس کتاب کو اشارے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ پراشارہ چلا آ رہا ہے۔ کہیں خود قرآن کے الفاظ میں اور کہیں قرآنی مفہوم اپنے الفاظ میں۔ مثلاً اسرار و رموز کے چند اشعار لیجئے۔

آنکہ براعداد رحمت کشاد مکہ ما پیغام لا تثریب داد

نبی اکرم نے جب مکہ فتح کیا ہے تو سردارانِ قریش، جنھوں نے حضور کی ایذارسانی اور تکلیف دہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، باجولان سامنے کھڑے تھے۔ دنیا کے ہر قانون کی رو سے ان کی سزا قتل تھی۔ لیکن حضور نے اپنے انتہائی عفو و کریمانہ سے کام لیا اور فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ جاؤ۔ آج تم سے کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ حضرت یوسفؑ کی زبان سے آئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے بھائیوں کی ہر خطا کو معاف کر دیا تھا۔ ایک اور شعر ہے۔

ایک در زندان غم باشی اسیر انبی تعلیم لا تخزن بگیر

شب ہجرت کی صبح، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابابکر صدیقؓ کی معیت میں ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے کہ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ کان میں آئی۔ حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے حضرت صدیق اکبرؓ کی پیشانی پر ترود کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضورؐ نے اسے بجا ناپا اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ لا تخزن ان اللہ معنا۔ مت گھبراؤ۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ہے وہ واقعہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔۔۔ ان نبی تعلیم لا تخزن بگیر۔

یہاں صاحبِ مذہبِ کلیم حضرت موسیٰؑ کا احوال دربارِ شرعون سے آنا سامنا ہوا ہے اور جادو گروں کی رسیاں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سانپ بن کر دوڑنے لگی ہیں تو حضرت موسیٰؑ کو خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں لوگ

ان کی نگاہ فریبی سے حائر ہو کر اطل کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس پر اسذکر کی طرف سے ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ
 إِنَّكَ أَنْتَ الْكَافِرُ۔ اے موسیٰ مت گھبراؤ۔ یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اقبال، مرد مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ
 جو کھیسے سوئے فرعون نے رود قلب او از لا تخف محکم شود
 ان اشعار میں تو آیات قرآنی کے ایک ایک دو دو الفاظ ہی آئے ہیں۔ بعض اوقات پورے کا پورا مصرعہ
 آیت قرآنی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً وضیت کے پرستاروں کے تعلق کہتے ہیں۔

جِنِّتُ جَسَدِي بِسُورَةِ الْقُرْآنِ نَأْتِي حَلْوًا قَوْمَهُمْ ذَا أَرَابِئِ

سورہ ابراہیم میں ہے۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ
 يَصْطَلُوا نَهَاؤَ وَيَسُورُوا الْقُرْآنَ۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناپاس گزاری کی۔
 اور اس طرح اپنی قوم کو مہلاکت کے گھر میں لے گئے۔ یعنی جہنم میں داخل ہو گئے۔ اور وہ کسی بری جگہ ہے گھبرنے کی۔
 ان اشعار میں قرآنی الفاظ سے آیات قرآنی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی ہیں
 جن میں اپنے الفاظ میں قرآنی آیات کی طرف تلمیحات ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے متعلق فرماتے ہیں۔

بہرا ویرانہ آباد کرد طائفان را خانہ بنیاد کرد

پہلے مصرعہ میں ویرانہ سے اشارہ ہے سورہ ابراہیم کی اس آیت جلیلہ کی طرف جس میں حضرت ابراہیم نے بحضور بالاعت
 عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُيُوتًا مَبْنُوعَةً لِّذُرِّيَّتِي لِيُبَدِّلَنِي مِنْ مَلَكٍ إِلَى
 اس وادی میں آباد کر دیا ہے جس میں شگنکلی و شادابی کا اہم و نشان تک نہیں۔ اور دوسرے مصرعہ یعنی طائفان را خانہ
 بنیاد کرد میں اشارہ ہے سورہ بقرہ کی اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ وَعَجِدُوا لِلَّهِ أُولِيًّا أُولِيًّا لِّمَنْ
 أَنْ كَفَرْتُمْ يَنْتَهِى لِلظَّالِمِينَ وَالْعَافِينَ وَالزَّالِمِينَ السُّجُودِ۔ اور ہم نے ابراہیم و اسمعیل کو حکم دیا کہ وہ طواف
 کرنے والوں اور اعکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمارے گھر کو پاک کر دیں۔

میں نے ان اشعار کو محض نمونہ پیش کیا ہے ورنہ منہوم کا اعتبار سے اقبال کے پورے پورے پیغام سے بتایا جاسکتا ہے
 کہ وہ قرآن کے کس مقام کا ترجمان ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے پورے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔ پیام مشرق میں ہے۔

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم تیغ خون ریزم و خود را بہ نیا سے دارم

ہذا اگر یہ صحیح ہے کہ کسی مفکر کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس کے پیغام کے ماخذ اور اس کے فکر کی
 اساس کو نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال کے پیغام کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب تک پڑھنے والے کے سامنے قرآن
 نہ ہو جو اقبال کو اس طرح نہیں سمجھا تو اس کے الفاظ میں کھربہ جاتا ہے۔ یہ ثابت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی کے تعلق اقبال نے کہا تھا کہ۔

آشنائے من زمن بجانہ رفت از خستائیم تہی بیانہ رفت

من شکوہ خسروی اور ادم

اوحدیث دلبری خواہد زمن رنگ و آسب شاعری تو اہد زمن

نظر بیتائی چانم نہ دید آسکارم دید و پنہانم نہ دید

حکومت اور مملکت

دسمبر ۱۹۷۵ء میں، کراچی میں، پاکستان یوزر پریزائیڈنٹیز کا نفرنس منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔ تمام رکن اخبارات کو برائیت دی جائیں کہ وہ نہ تو ایسے خیالات کا اظہار کریں اور نہ ایسے اظہار کو اپنے ہاں اجازت ہی دیں جو سٹیٹ کے استحکام کے منافی ہوں، عام اس کے کہ وہ خیالات مذہب ہی سے منسوب کیوں نہ کہے جائیں۔

اس قرارداد پر جس انداز سے بحث و تمحیص ہوئی وہ اس حقیقت کا غماز تھا کہ بہت سے قلوب و اذہان میں حکومت (State) اور مملکت (Polity) کا فرق واضح نہیں۔ جس کی وجہ سے وہ عجیب قسم کے ذہنی اختلال و انتشار میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ ابھی تک فلسفہ سیاست (Political Philosophy) عام نہیں ہوا، اس لئے یہاں اس قسم کے مسائل و مباحث پر بہت کم لکھا گیا ہے کہ مملکت کسے کہئے ہیں۔ فرد اور مملکت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ حکومت اور مملکت میں کیا فرق ہے۔ آئین کی پابندی اور حکومتی میں کیا فرق ہے۔ حکومت کا قانون کس حد تک افراد کی شخصی آزادی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ کیا قانون کا احترام محض مملکتی مصالح پر مبنی ہے یا اس کی کوئی مستقل قدر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مسائل طلوع اسلام کے پیش نظر میں لیکن ہنگامی حوادث اس قدر سامنے آ رہے ہیں کہ وہ ان مسائل کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں دیتے۔ ذرا ان حوادث سے فرصت مل جائے تو انشاء اللہ ان مباحث پر بھی گفتگو ہو جائے گی۔ اس وقت ہم صرف اس الجھاؤ کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو حکومت اور مملکت کا فرق ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہو رہا ہے اور جو ہمارے نزدیک بہت سی بنیادی خرابیوں کا موجب بن سکتا ہے۔

مملکت (State) ایک مجرد اصطلاح ہے جس کا مفہوم چند الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کے عناصر ترکیبی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک نقطہ زمین میں، بسنے والے افراد (جسے ملت کہتے) اپنے لئے ایک نظام زندگی متعین کرتے ہیں اور اس نظام کو نافذ العمل کرنے کے لئے اسے آئینی شکل دیتے ہیں جس سے زندہ نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس میں، ملت، نظام، اور آئین کے تصوراتی مجموعہ کو ناکات کہتے ہیں۔ حکومت، انہی نتائج سے اس شیعری کا جو اس آئینی نظام کو نافذ کرتی ہے، انسانی ہدایت، استہدایہ

ابتدائی ادوار میں حکومت اور مملکت میں بالعموم کچھ فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ مملکت نام ہوتا تھا سلطنت کا اور کنوٹ عبارت ہوتی تھی سلطان کی ذات سے۔ چنانچہ سلطنتیں، سلاطین کی شخصیتوں سے قائم یا ختم ہوتی تھیں۔ ایک بادشاہ مر گیا، مارا گیا یا گرفتار ہو گیا، تو اس کی سلطنت بھی ختم ہو گئی۔ یا اس سے آگے بڑھی تو سلطنت ایک خاندان میں محدود ہو کر رہ گئی، یعنی اس وقت کی دنیا کا نظام اجتماعی، اشخاص سے وابستہ ہوتا تھا۔ اس کا اثر یہاں تک غالب تھا کہ میدان جنگ میں ایک سپاہی کے گرفتار ہو جانے سے یا مارے جانے سے ساری کی ساری فوج مفتوح و مغلوب ہو جاتی تھی۔ یہی پوزیشن دارالسلطنت کو حاصل تھی۔ اگر کسی سلطنت کا دارالخلافہ فتح ہو گیا تو ساری سلطنت قبضہ میں آگئی۔ چونکہ سلطنتیں، سلاطین کی ذات سے وابستہ ہوتی تھیں اس لئے سلاطین، تمام قوتوں کو اپنی ذات میں محصور رکھتے تھے۔ سلطان کے اذن لب اشائی، سلطنت سے غداری یا بغاوت پر محمول ہو جاتی تھی، اسی سلطانی اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ان کے بانی حقوق (Divine Rights) کا ابد فریب عقیدہ وضع کیا گیا جس سے بادشاہ نبل اللہ (خدا کا سایہ) اور ایسٹور کا و تار قرار پا گیا۔ اب اس کی ذات ہر قسم کی تنقید کی حد سے بالا ہو گئی۔ اس کا تقدس جزو ایمان بن گیا۔ یہ تھے وہ سہارے جن کے بل بوتے پر ازمنہ مظلمہ میں انسان اپنے اقتدارِ امریت کو قائم رکھا کرتا تھا۔

قرآن نے دنیا کو سلطنت کی جگہ خلافت کا تصور دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں اس سے پہلے کہیں کہیں تصور جمہوریت کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے ہیں، لیکن خلافت کے انقلابی تصور کو اپنی منضبط شکل میں سب سے پہلے قرآن ہی نے پیش کیا ہے۔ ہمیں اس وقت سلطنت اور خلافت کے تمام پہلوؤں کا تقابلی تصور نہیں۔ (یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور فرصت کی منتہا منی) اس وقت ہم صرف اس کے اسی حصہ کی طرف اشارہ کریں گے جس کا تعلق مملکت اور حکومت کے فرق سے ہے۔ قرآن کی رو سے اہل شیعہ جماعت یا ملت ہے۔ ملت مسائل اجتماعی سے عہدہ برہم ہونے کے لئے اپنا مرکزی ادارہ قائم کرتی ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ حکومت بدلتی رہتی ہے۔ یعنی افراد حکومت ایک کے بعد دوسرے آتے رہتے ہیں کہ خلافت کے معنی ہی ایک کے بعد دوسرے کے ہیں) اللہ باری کی مملکت، اللہ سے ہوتی ہے، افراد حکومت، تاریخ میں، اللہ اور خدا وین ہونے کی جہت سے، ملت کے ساتھ باہر ہوتے ہیں۔ اور ملت، آئین الہیہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ جو بدعتیں ہیں، اللہ کی مملکت کو افراد حکومت پر تنقید کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ افراد ملت ہی کے نامزد ہوتے ہیں اور ملت کو اختیار ہوتا ہے کہ میں وقت مناسب سمجھے، اپنی نمائندگی کسی اور کو تفویض کر دوں۔

مسائلوں نے کس طرح تصور خلافت کو پھر سے سلطان (ملوکیت) کی انت میں بدل دیا، یہ ایک حدیث ہے دیکھنا اور پاکستان ہے، الم انگریزوں سے اس وقت چھوڑیے، سردست یہ دیکھئے کہ خلافت کا جو تصور قرآن نے دیا تھا اور جسے نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی جماعت نے دنیا میں شکل کر کے دکھایا، وہ چونکہ قرآن سے باہر کہیں اور نہ تھا اس لئے باقی دنیا اس تصور سے محروم تھی اس لئے وہ عقلی طور پر مملکت اور حکومت کی گتھیاں

سجھانے میں مصروف رہی، تاکہ انسان نے ملوکیت کے تلخ تجارب سے تنگ آکر نظام حکومت کی کوئی بہتر شکل اختیار کرنی چاہی اور یہ شکل مغربی جمہوریت کے پیکر میں دنیا کے سامنے آئی (اس جمہوریت اور قرآنی خلافت میں کیا فرق ہے؟ بحث بھی جداگانہ ہے اور فرصت کی محتاج)۔ ہر چند، یہ شکل انسان کے اس تقاضا کو پورا نہیں کر سکتی تھی جو ملوکیت کے ردِ عمل کے طور پر اس کے سینہ میں ابھرا، لیکن اس سے اس کی تسکین ضرور ہو گئی کہ اس نے قہرِ نابتِ سلطانی سے انتقام لے لیا ہے۔ اس تبدیلی سے انفرادی اقتدار سے، جماعتی تصور کی طرف ایک قدم ضرور اٹھا۔ لیکن افراد کے منہ قوت کا جو ہولنگ چکا تھا اس کا مزہ چھوٹے چھوٹے ہی چھوٹا سکتا تھا۔ اختیار مطلق کا یہ "مزہ" ڈکٹیٹر شپ (آمریت) کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اس نے آکر پھر اسی آئین کہن کو تازہ کر دیا جس کی رو سے مملکت اور حکومت میں کچھ فرق نہیں ہوتا تھا اور مملکت کا وجود، ایک فرد کی ذات سے وابستہ ہوتا تھا۔ اب مملکت پھر عمارت ہو گئی فرد یا افراد کی، ایک جماعت سے اور افراد و مملکت کا فریضہ زندگی اس "مملکت" (یعنی ایک فرد یا مخصوص جماعت) کا قیام و بقا قرار پا گیا۔ اب پھر حکومت اور مملکت کا فرق مٹ گیا اور افراد حکومت پر تنقید، مملکت پر تنقید کے مرادف ہو گئی، کہ مملکت نام ہی ان افراد حکومت کا قرار پانگئی۔ اب پھر اس عقیدہ کی تجدید کی گئی کہ "سنشیت مقدس" ہے اور اس کی تقدس کا تقاضا ہے کہ کوئی اس پر تنقید نہ کرے۔ "ربانی حقوق" کے اس بالواسطہ اعادہ سے پھر افراد حکومت تنقید کی حد سے بالا ہو گئے۔

انسانیت کی تاریخ (سوائے اس تنویر سے عرصہ کے جب قرآنی تصور مملکت و حکومت اپنی عملی شکل میں شہود ہوا ہے) اسی گردشِ دولابی میں مبتلا چلی آ رہی ہے۔

ان مہادیات کو سامنے رکھ کر اب پاکستان کی طرف آئیے۔ مملکت پاکستان بھارت ہے ملت پاکستانیہ سے، جس نے ایک خاص نظام زندگی کو اس خطہ زمین میں نافذ العمل کرنے کے لئے اپنا جداگانہ شخص دینا سے منایا ہے۔ اس نظام کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے اس نے اپنے میں سے کچھ افراد کو نامزد کیا ہے، جن کے مجموعہ کا نام ہے حکومت پاکستان۔ لہذا مزہ و پائندہ شے ملت ہے، حکومت نہیں، حکومت لوٹے بدلتے والی شیزری ہے، افراد حکومت ملت کے نامکدے ہونے کی جہت سے ملت کے سلسلے جمابند ہیں اس لئے ملت کو ان پر تنقید کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ تنقید ہی کا نہیں بلکہ عند الضرورت بدل دینے کا بھی۔ خلافتِ نوحیہ بیتِ بلند تصور ہے۔ مغربی جمہوریت میں بھی یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے ضروری سمجھا تو جمہوریت کو الگ کر کے چرچیل کو لے آئے اور جب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تو اسے ملے اس تقاب سے یہ نہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم مغرب نے نظامِ جمہوریت کو زیادہ قابل قبول سمجھے ہیں۔ قرآنی تصور حکومت و مملکت کی رُند سے بھی ایسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا آئینِ آمریت۔ امرت بحث صرف ان مرد و اسالیب حکومت سے ہے۔

۵۵۔ یہاں اس بحث کو چھڑنے کا موقع نہیں کہ قرآنی خلافت میں تنقید کیسے اور کس مقام پر ہو سکتی ہے اور تنقید اور اطاعت کیسے ساتھ ساتھ چلی سکتی ہیں اور افراد حکومت کو الگ کن حالات میں کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے کسی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ افراد حکومت بدلتے رہے اور مملکت بدستور قائم رہی۔ لہذا انفرادی حکومت پاکستان پر تنقید مملکت پاکستان پر تنقید نہیں کہا سکتی۔ جو لوگ مملکت کو تنقید کی حد سے بالا قرار دیکر حکومت کو تنقید سے بالا رکھنے کی تمہین کرتے ہیں وہ مملکت، حکومت کے بنیادی فرق کو نگاہوں سے اوجھل کر کے ایک بہت بڑی غلط روی کے مرکب ہوتے ہیں۔ مملکت پاکستان پر تنقید کا ایک ہی منہبم ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسی حرکت کی جائے جس سے اس مملکت کے استحکام کو ضعف پہنچے۔ یہ تنقید نہیں، مملکت پاکستان سے خالص غداری ہے جس کی سزا تختہ دار ہے۔ لیکن حکومت پر تنقید مملکت سے غداری نہیں قرار پا سکتی۔ حکومت کی تضعیف مملکت کی تضعیف نہیں۔ حتیٰ کہ حکومت کا بدل دینا، مملکت پاکستان کا کسی دوسری مملکت میں بدل دینا نہیں۔ لہذا ان دونوں کو غلط لفظ نہیں کرنا چاہئے۔ حکومت پر تعمیری تنقید بڑے صالح نتائج کا موجب ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید درحقیقت مشرہ کی ایک شکل ہے اور بہترین حکومت، مشاورت پر قائم ہوتی ہے۔ لہذا تنقید صالح کو محبوب قرار دینے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں وہی قومیں زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہیں جو اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ اور محاسبہ کی بہترین شکل تنقید ہے۔ جو حکومت تنقید کو برواشت نہیں کر سکتی اور اس کے لئے مملکت کو انہی سپر بنا جانتی ہے۔ یعنی جماعت کو یہ کہہ کر تنقید سے روکنا ہاں ہی ہے کہ یہ تنقید مملکت کے خلاف ہے اور اس کی کمزوری کا باعث، وہ مملکت کی ہی خواہ نہیں۔ وہ سخت خود غرض ہے اور قطعاً اس قابل نہیں کہ زمام ملت اس کے ہاتھ میں رہے۔ بڑھنے والی قوموں میں ہمیشہ وہ لوگ مٹاؤ قرار پاتے ہیں جو مملکت کے ہی خواہ اور حکومت کے نکتہ چیں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ٹوہنے والی قوموں میں افراد حکومت ان لوگوں کو اپنے قریب رکھتے ہیں جو مملکت کے غدار ہوتے ہیں لیکن حکومت کے سٹائش گر۔ ہماری بد بختی سے پاکستان میں اس وقت ہی ہورہا ہے۔ وہ لوگ جو تمام عمر پاکستان کے نظریہ اور عقیدہ کے سخت ترین مخالف رہے ہیں اور لہذا مملکت پاکستان کے دشمن) وہ آج ارباب حکومت کی اڑ میں ہاں ملانے سے، سائید اثر و اقتدار پر فائز ہیں اور وہ افراد ملت جنہوں نے اس عقیدہ کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کی ہے اس جرم کی پاداش میں محتوہ ہیں کہ وہ ارباب حکومت کو ان کے فرائض صحیحہ کی یاد کیوں دلاتے ہیں۔

ہم پاکستان کے اخبارات کے مدیر حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ مملکت پاکستان کے استحکام اور افراد حکومت پر تنقید کے اس بنیادی فرق کو عوام اور ارباب اقتدار کے سامنے لائیں اور تنقید کے اس اہم فریضہ سے کبھی نہ جوگیں کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کین کا چارہ

سنہ حکومت پر تنقید اور حکومت کے فیصلوں سے سرکشی، دیگر مختلف چیزیں ہیں۔ کیا حکومت کے فیصلہ سے سرکشی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اصلاح کی جا سکتی ہے تو کن حالات میں؟ یہ سوالات مستقل موضوعات ہیں جنہیں عند الضرورت سامنے لانا چاہئے گا۔

باب المراسلات

کوئٹہ سے ایک صاحب رقم طراز ہیں:-

۱۔ شکر اعلیٰ اللہ و بجدہ کہ طلوع اسلام کے دورِ جدید کا ایک سال بجز و خوبی اور کامیابی سے گذرا۔ اور اب طلوع اسلام کی جیت تو کا دوسرا سال شروع ہوا۔ گو مجھے طلوع اسلام کی باقاعدہ خریداری کا شرف حاصل نہ ہوا لیکن میں اس کا ایک مسلسل خواندہ (عرصہ ایک سال سے) ضرور ہوں۔ اور وہ اس طرح کہ یہاں مقامی انجمنوں سے پرچہ ماہ بہ ماہ خریدتا ہوں۔

۲۔ طلوع اسلام نے ایک سال کے عرصہ میں ملک و ملت کی جو جو عظیم الشان خدمات، جس دیانت، جس صداقت پسندی، جس متقانہ اور مؤمنانہ بے باکی، جس اخلاص و بے لوثی اور جس حق پرستی اور ملت دوستی سے سراہا جاویں وہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے لئے مسلمانانِ پاکستان طلوع اسلام کے مہیوں و ممنون ہیں۔ اور اس لئے طلوع اسلام کو نئے سال کے آغاز پر مجھ جیسے ایک، پھیریز کو بھی مبارک باد کہنے کی جرات ہو چکی ہے!

۳۔ نہ صرف یہ، بلکہ جن لوگوں کو تحریک پاکستان کے دور میں طلوع اسلام کو پڑھنے کا اتفاق ہوا وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس وقت سلسلہ متحدہ قومیت اور اس قسم کے دیگر بے شمار موم و موموم مباحث میں علامہ اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور طلوع اسلام نے مسلمانوں کی جو رہنمائی کی ہے وہ وقت کی سب سے بڑی اور اہم ترین ضرورت تھی۔ اور یہ کہنا ہرگز بے گناہ نہ ہوگا، کہ ان ہی مساعی کا ثمرہ خدائے غفور و رحیم نے ہم کو پاکستان کی صورت میں عطا فرمایا! طلوع اسلام اس جہادِ عظیم کے لئے پھر مبارکباد کا مستحق ہے۔ اور ملت اسلامیہ اس کی مشکوٰۃ!

۴۔ جس طرح ہر مہی برحق و صداقت بات کو طلوع اسلام ملک و ملت کی فوز و غلامی کی خاطر ہر وقتی اور مقامی اثر سے بالاتر ہو کر قلندرانہ کہہ گندا ہے۔ عین اسی طرح طلوع اسلام کی بیش بہا خدماتِ جلیلہ کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اگر چند سخیلے گفتمی میں بھی نہایت ہی مخلصانہ طور پر عرض کر دوں تو امید ہے کہ آپ کی طبیعت کلدرد نہ ہوگی۔ اور وہ یہ کہ:-

طلوع اسلام کے مطالعہ سے میں باکراہ تمام اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طلوع اسلام اگرچہ مسلمانوں

کی متابعت میں اور ملک و ملت کی بہتری و بقا کے پیش نظر عمومی تعاون کا مستحق تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس پر بھی جب ہماری حکومت کے مزاج میں ٹکدہ آیا اور اس نے قیام نظامِ الہی سے پہلو تہی کرنے کی خاطر جب جماعتِ ہذا کی زبانِ مبدی کی تو طلوعِ اسلام نے جماعتِ اسلامی کو قادیانیت سے بھی بدتر قرار دیا۔ حالانکہ یہ کام حکومت کو کسی ملامتوں سے گزارنا تھا۔ مگر بد قسمتی سے اس معاملہ میں بھی طلوعِ اسلام کا دامنِ داغدار ہو کر رہ گیا۔ آپ نے نوبر کے شمارہ میں کہا تھا کہ جماعتِ اسلامی کا "قادیانیت کا بروز" ہونا ہم کسی دوسری صحبت میں دلائل و براہین سے ثابت کریں گے۔ پبلک آپ کی اس حقیقت کشائی کا نہایت ہی بے قراری سے منتظر ہے۔

(۵) متعجب نہ کیجیے، مخلصانہ اور نیاز مندانہ رائے ہے، کہ طلوعِ اسلام کو تعصب سے بند و بالا ہو کر کام کرنا چاہئے۔ کیونکہ حق کے ایک علمبردار پر حق کی حمایت و چاہے حق کہیں بھی ہو فرضِ عین ہے۔ امید ہے آپ میری ان مخلصانہ گزارشات کو پرانہ منائیں گے۔ کہ سے

بہ نزدیک آنکہ نکو خواہ و تست

کہ گوید فلانی خار در راہِ تست

اور ان ہر بوقت فرصت ٹھنڈے دل سے غور کر کے سالِ نوسے ملک و ملت کی خدمت اس قسم کی خامیوں سے مبرا ہو کر کریں گے۔ فقط والسلام۔

ہمارے بھائی نے ایک طرف طلوعِ اسلام کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ملک و ملت کی جو جوضرات اس نے "حسب دینت" جس صداقت پسندی جس عقائد اور مومنانہ بے باکی جس اخلاص و بے لوثی اور جس حق پر ڈھکی اور ملت دوستی سے سراہنا ہم دی ہیں وہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی۔ اور اس کا شیوہ یہ بتایا ہے کہ یہ "ہرینی برحق و صداقت بات کو ملک و ملت کی فو و فزات کی خاطر ہر وقتی اور ہنگامی اثر سے بالاتر ہو کر قلندرانہ کہہ گذرتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اشارہ ہوتا ہے کہ جس شخص یا گروہ کے تہیہ خدمتِ خلق کے پروگرام اور طریقے یا رستے ہمارے اربابِ حل و عقد کے ذاتی مفاد، مگر اسے جن تو طلوعِ اسلام میں اس جرات کی کمی ہے کہ وہ پارٹی بازی کے کمروہ اثر سے بلند ہو کر قلندرانہ احباب کے مقابلہ میں اس کی ہموانی کرے۔

یعنی ایک طرف طلوعِ اسلام قلندرانہ بے باکی اور بے لوثی اور مومنانہ صداقت پسندی اور حق پر ڈھکی کے جوہر دل کا حامل ہے اور دوسری طرف اس کی حالت یہ ہے کہ اس کی نگاہ اربابِ اقتدار کی پیشانیوں کی طرف رہتی ہے۔ جس شخص یا گروہ کے کسی مسلک سے ان پیشانیوں پر بل پڑ جاتا ہے، طلوعِ اسلام اس کی ہموانی سے خاموش ہو جاتا ہے۔ نہیں، بلکہ اربابِ اقتدار کو خوش کرنے کے لئے اس کی مخالفت بھی شروع کر دیتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ایک ہی شخص کی زبان سے "ایک ہی ادارہ (طلوعِ اسلام) کے متعلق" ایک ہی وقت

ہر طرف سے خطرات کا اندیشہ تھا۔ تو اگر وہ علامہ صاحب کی اس تحریک (انڈیا پاکستان لیگ) کو ملت کے لئے مفید سمجھے تو اس کی تائید میں کوئی لامرناج ہو سکتا ہے؟ ہم اس تحریک کو تدارکِ اِخْلَاصِ دونوں سے عاری سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ہماری اس رائے کو غلط سمجھیں لیکن یہ کہہ دینا کہ چونکہ اربابِ حکومت اس کی نفی کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے اس کی تائید نہیں کی بڑی زیادتی ہے۔

اب دوسری مثال ایسے۔ آپ نے کہا ہے کہ جب حکومت نے اسلامی جماعت کو اپنی مصلحتوں کے خلاف سہما تو ہم نے بھی اس کی مخالفت شروع کر دی اور حکومت کے ایسا پروہ کام کیا جو انگریزوں کے زمانہ میں ملامٹے کیا کرتے تھے! اس کے لئے ہم پھر بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے اس بھائی نے طلوعِ اسلام کے سابقہ دور کا مطالعہ کیا ہے تو انہیں یہ یاد ہوگا کہ طلوعِ اسلام نے اسلامی جماعت کے مسلک کے خلاف (۱۹۴۱ء) میں اس وقت آواز اٹھائی تھی جب حکومت کے بڑے سے بڑے افسر اس جماعت کے ہمنوا ہو کر تھے تھے۔ ہم نے اس وقت ہی کہا تھا اور اس کے بعد اس حقیقت کو اب پھر بار بار دہرایا ہے کہ اس لڑائی میں ہم اور اسلامی جماعت کس حد تک زنجیق سفر ہو سکتے ہیں اور کہاں سے ہم میں اور ان میں فراقِ جفا و مینک شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آج ہی اسلامی جماعت اپنے اس مسلک کو بدل لے جسے ہم غلط سمجھتے ہیں تو ہمارا پورا تعاون ان کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ساتھ ان کے اس غلط مسلک سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ لہذا جب طلوعِ اسلام نے یہ اختلافی آواز اٹھائی تو اس نے بھی اٹھائی تھی تو یہ کہنا کہ جس وقت اس نے دیکھا کہ اربابِ حکومت اسلامی جماعت کے خلاف ہیں تو اس نے بھی مخالفت شروع کر دی، کس قدر واقعات کے خلاف ہے۔

جس زمانہ میں احزاب کی تحریک زوروں پر تھی، ان کی عام روش یہ ہوتی تھی کہ جو نہی کسی نے ان کے خلاف کوئی بات کہی تو انہوں نے چلا کر کہہ دیا کہ یہ مرزائی ہے! بس اس کے بعد اس بچارے کو جان بچانی شکل ہو جاتی تھی۔ یہ ذہنیت احزابوں تک ہی محدود نہ تھی۔ ہم لوگوں کی عام طور پر یہ حالت ہو رہی ہے کہ جس بات کو ہم درست سمجھتے ہیں، اگر کوئی اس کی موافقت میں کچھ کہتا ہے تو ہم ہر جگہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسے حق و صداقت کا علمبردار قرار دیتے ہیں لیکن جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم سوچیں کہ اس کے پاس اپنے اس مسلک کی تائید میں کیا دلائل و براہین ہیں، فوراً نعلِ برائتس ہو جاتے ہیں پھر اس کی طرف ذلیل سے ذلیل مقاصد (Motives) منسوب کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مخالفت کو ختم کر دیا۔

آخر میں ہم اپنے اس بھائی کی خدمت میں صرف متاعرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انہوں نے طلوعِ اسلام کے ایک سال کے پرچے پڑھنے سے اس کے متعلق ہی اندازہ لگایا ہے کہ اس کی طرف سے مسائل و معاملات کی مخالفت یا موافقت اربابِ اقتدار کے ایسا ہر ہوتی ہے تو وہ جو یہ طلوعِ اسلام خیر نے پرصاف کرتے ہیں اسے کسی بہتر مصرف میں لگائیں۔ اگر طلوعِ اسلام ایسا ہی بددیانت ہو تو اس پر یہی خرچ کرنا سخت گناہ ہے اور اگر وہ دیاقتدار لیکن آپ کو بددیانت نظر آ رہا ہے تو طلوعِ اسلام کو کسی ایسی جگہ کے سامنے جانے دیجئے جس میں یہ نقص نہ ہو۔

پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم جدید

— (ایک جائزہ) —

غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت، آل انڈیا مسلم لیگ، تقسیم کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ میں تقسیم ہو گئی۔ فروری ۱۹۷۳ء میں پاکستان مسلم لیگ کو نسل نے فیصلہ کیا کہ پاکستان میں مسلم لیگ کو از سر نو منظم کیا جائے اور اس کے لئے نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں۔ یہ گرانقدر فیصلہ چودھری غلیق الزماں کے سپرد ہوا۔ چودھری صاحب نے سابقہ مسلم لیگی نظام کو مطلق کر کے انتخابات تو کا اعلان کیا۔ یہ انتخابات ابتدائی لیگوں سے لے کر مرکزی لیگوں تک کے ہونے تھے۔ گویا پاکستان میں مسلم لیگ کی از سر تازہ تجدید و تنظیم کرنی تھی۔ چودھری صاحب کے لائحہ عمل اور اوقات نامہ کے مطابق اس تنظیم جدید کو گذشتہ جولائی میں مکمل ہو جانا چاہئے تھا، لیکن یہ ہم ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی۔ بہر کیف نئی پاکستان مسلم لیگ کو نسل کے اولین اجلاس کے انعقاد کی توقع مسروری میں کی جا رہی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس کا جائزہ لیں کہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کن خطوط پر ہوئی آپ اس حقیقت کو خصوصیت سے پیش نظر رکھئے کہ سابقہ آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان کے نصب العین کے صداقت کی بنا پر باطنی سیاست پر ایک جدا گانہ اور ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے دیگر سیاسی احزاب کو اس کے سامنے سپر ڈال دینا پڑی۔ اس مطالبہ کے مؤید غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان مویدین میں وہ سب مسلمان بھی پیش پیش تھے جنہیں اقلیتی صوبوں کے مسلمان کہا جاتا تھا اور جن میں کا خوش فہم ترین بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو ان کا علاقہ حدود پاکستان میں شامل ہوگا۔ پاکستان کے حق میں یہ اہم ترین دلیل دی جاتی تھی کہ اس سے نہ صرف وہ مسلمان آزاد اور محفوظ ہو جائیں گے جو حدود پاکستان میں ہوں گے بلکہ پاکستان بعینہ مسلمانان ہند کے تحفظ کا ضامن بھی ہوگا، اس تصور آزادی اور ضمانت حفاظت کے علاوہ مسلمانوں کے پیش نظر بے عظیم الشان مقصد بھی تھا کہ انھیں ایک ایسا خطرہ مل جائیگا جہاں وہ قرآنی نظام حکومت کو نافذ راج کر سکیں گے، اس نشاط تصور سے وہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر دیوانگی اور عشق سے مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی مسلم لیگ سے وابستگی و حقیقت تصور پاکستان سے وابستگی تھی، اور یہ تصور ایک سیاسی تصور وطن ہی نہیں تھا بلکہ اس نظام حیات کا تصور تھا جس کا حامل

قرآن ہے اور جس کی تنفیذ و ترویج کا باعث خطر امن پاکستان ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگ نے مسلمانان ہند کو ایک علم اور ایک مقصد تو ضرور دیا لیکن جس سیاسی ماحول میں اور جن سیاسی حریفوں سے اسے پاکستان کی جنگ لڑنا پڑی اس سے مسلمانان ہند میں وہ حقیقی شعور قومی پیدا نہ ہو سکا جو شروع قومی کو بیدار کر کے ملی انارکوا انہار و تربیت کے مواقع بخشا ہے۔ دس کروڑ کی بھیر سے چند متفقہ نعرے تو ضرور بلند ہونے لگے اور طبع وحدت نے قلب و نگاہ میں ایک گوند حرارت بھی پیدا کر دی لیکن جب ملت کو وطن عطا ہوا تو پہلے قدم پر ہی "ملت" کی تعلق کھل گئی جس جوہم کوہ جیسا سمجھا جا رہا تھا اس کے دل آپس میں پھٹے ہوئے تھے، مقاصد عالیہ اور مفادات ملی بالعموم ان نظر فریب پردوں کے نام سے جن میں خود غرضیوں اور ملت فرودیشیوں کے پوٹیاں بچ رہے تھے۔ ملک ہاتھوں میں آیا مگر ملت کی آنکھیں اس سے دکھلیں!

قیام پاکستان کے ساتھ ہی جبرنجبت سے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مسلمان ہر حیثیت مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے دم و گرم پر ہو گئے اور بیت حد تک ٹسکت خوردہ اٹھو پاکستانی حدود کے اندر مسلمان بری طرح مایوس اور تاسف ہوئے، وہ غیر معمولی حوادث و نوازل کا شکار بنے اور ان کے محبوب لیڈر جنس انہوں نے دیوانہ وار دوش دیتے تھے ان کی بیشتر توقعات پوری کرنے سے قاصر رہ گئے۔ لیکن کی ایک صورت اسلامی حکومت کے تصور سے تھی، اس کے متعلق جس پریشان خیالی اور علی استہزاء کا مظاہرہ ہوا اس سے امید کا یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔

ان غیر متوقع اور کمر شکن مصائب کے لئے قوم ہرگز تیار نہیں تھی۔ نعرہ باز قوم تلخ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار کیسے ہوتی! ان میں سے کسی نے بھی اس آنے والے طوفان خون و مرگ کا اندازہ نہیں کیا تھا اور اگر کسی کی نگاہ اس کا درخشاں خاکہ دیکھ بھی سکی تو اس نے اپنے تاثرات سے قوم کو آگاہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ نتیجہ نظر ہے۔ سابقہ لیڈروں کے خلاف ہمہ گیر عدم اطمینان قابل فہم اور قدرتی ہے۔ وہ حوام جو اسلامی حکومت کو سامنے آتا دیکھ رہے تھے اور اس سے مطابقت کی تیاری کر رہے تھے وہ پھر آنکھیں میسج کے پڑ رہے۔ اب کہ وہ سونہیں گئے، سونہیں سکتے! وہ بیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ وہ یقین نہیں کر سکتے کہ

درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری!

وہ اس نظام سے جسے بضرط سہولت فہم ہم پاکستانی نظام کہنا چاہتے ہیں، بدستور سابق غیر شطرنج یا غیر متاثر نہیں۔ وہ انگریزی نظام سے غیر متاثرہ کہتے تھے، کیونکہ وہ ان کا اپنا نظام جانتے نہیں تھا۔ وہ پاکستانی نظام جیات سے کیسے دوڑ رہتے ہیں؟ ان میں جذبات فیظ و غضب ابھر رہے ہیں۔ ہلاک کے چمے پھر سے کب پھوٹتے ہیں؟ یہ صدیوں کی سوئی پٹی قوم کب بیدار ہوتی ہے؟ اس کا حسابی اندازہ ناممکن ہے، لیکن جب جامد سے جامد ملت بھی حاضر و موجود سے بیزار ہو جاتی ہے تو وہ سوئی نہیں رہ سکتی۔ بیزاری علامت ہے بیداری کی۔ یہ علامات قبل از وقت ہو سکتی ہیں، غلط نہیں ہو سکتیں!

پاکستان کی حکومت شروع مروجہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قائم کردہ ہے۔ اس مرنے والی میں بہت سی نویاں تھیں لیکن اس کے خلف پد سلطان بودہ تو سب تان کر کہہ سکتے ہیں مگر "تراچہ" کا جواب ان کے پاس نہیں

یہ موقع حکومت کی انتظامی خوبیوں یا خامیوں پر تبصرے کا نہیں، اسی لئے ہم محض اشارات پر اکتفا کرتے ہیں اور اس حقیقت کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں پاکستان میں مسلم لیگ کی سابقہ متاثر حیثیت باقی نہیں رہی۔ ملت اس کی حکومت کے متعلق وہ حسن ظن پر گور نہیں رکھتی جو اسے اس جمعیت سے تھا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے اور اس کا اعلان ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حالات مسلم لیگ سے متفرج ہونے کی علامت نہیں بلکہ ثبوت ہیں کہ جمعیت کو پھر سے میدان میں آکر اپنے آپ کو بحال کرنا چاہئے۔ بظاہر یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور مسلم لیگ کے انتخابات اسی عزم و اقدام کا پتہ دیتے ہیں لیکن اب آئیے دیکھئے ان انتخابات کے جلیز میں کیا سہا یا سہو رہا ہے!

قیام پاکستان سے پیشتر کارکنان مسلم لیگ کے لئے مقالات عروج و گھاہ مناصب لیگ تھے۔ چنانچہ وہ خدمت اور محنت کے طویل اور غیر یقینی راستے سے یا مجلسی حیثیت سے کہ وہ اکثر موردی ہوتی تھی کے مختصر سہل اور یقینی راستے سے جماعتی مہدوں تک پہنچا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ سے وابستگی میں ایک اور دلکشی ہی پیدا ہو گئی۔ یہ دلکشی زیادہ جاذب اور نشہ آور ہے۔ پہلے مسلم لیگ سے وابستگی سے صدارت وغیرہ قوم کا کوئی عمدہ میسر آنے کی امید ہوا کرتی تھی۔ اب اس وابستگی کا نتیجہ وزارت کبھی نکل سکتا ہے۔ اس دو گونہ دلکشی نے جاہ پرستوں کو مسلم لیگ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ عہدوں اور مناصب کی ہوس نے ان دشمنان لیگ کو پکا لیگی بنا دیا ہے جو آج تک اس میں شمولیت نہیں اختیار کر سکے تھے۔ ان نو واردوں سے مسلم لیگ میں دو طبقے بن گئے ہیں۔ ایک طبقہ ان فائزین مرام کا ہے جو اس وقت لیگ کے نامزدگان کی حیثیت سے وزارتوں پر متمکن ہیں۔ دوسرے طبقے میں ایک طرف تو وہ حضرات ہیں جو لیگی ہونے کے باوجود اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہوئے کہ انھیں وزارتوں سے نوازا جانا یا اگر انھیں نوازا گیا تو انھیں فخر و ترنا مناصب کی ہوس میں حاصل شدہ منصب کو کبھی ہاتھ سے چھوڑ دینا پڑا۔ دوسری طرف اس طبقہ میں وہ اصحاب ہیں جنھیں ہوس مناصب کٹاں کٹاں حلقہ لیگ میں لے آئی ہے۔ دوسرے طبقہ کے دونوں ذیلی گروہ باہم متفق نہیں لیکن اشتراک اغراض نے انھیں مشترک مناصب کے مقابلہ میں اکٹھا کر دیا ہے۔

مسلم لیگ کی فروری کی ایک منظور شدہ قرارداد کے مطابق ارکان حکومت مسلم لیگ کے عہدہ دار نہیں ہو سکتے۔ اس فیصلہ سے موجودہ راج باب حکومت جو کبھی مسلم لیگ کے عہدہ دار ہی تھے اب مسلم لیگ کے عہدہ دار نہیں رہے۔ لیکن چونکہ وزراء مسلم لیگی ہیں اور مسلم لیگی ہونے کی حیثیت سے انھیں مسلم لیگ کے ضابطہ اور نظام کے مطابق چلنا چاہئے اس لئے جماعت یعنی مسلم لیگ کو وزارتوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس برتری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جماعتی دباؤ سے وزارتوں کو جھکا یا اور مزید کیا جاسکتا ہے اور دوسرا پہلو یہ کہ وزارتوں تک پہنچنے کا یہ ایک وسیلہ بھی ہے۔ کام چوریوں اور ہوس رانیوں کی اس جنگ میں خدمت اور خلوص کے جذبات کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ مسلم لیگ کا شیخ اب تک امر کا خصوصی اجارہ چلا آیا ہے۔ ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شخص گناہی سے معصن ذاتی جوہر کی بنا پر مسلم لیگ میں امتیاز حاصل کر سکا ہو۔ بنا پر عوامی کارکن انتہائی لیگوں میں توسطتے ہیں

اعلیٰ اداروں میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے برعکس، میرا بنائے وقت نے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ دولت کے زور سے مسلم لیگ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے عام اس سے کہ ان کا ماضی کسی طرح ہی کیوں نہ گذرا ہو۔ چنانچہ تمام پاکستان کے بعد بھی سیاسی "قلبِ اہمیت" کا سلسلہ تیز تر ہو گیا اور خلافتِ مسلم لیگ حضرات جوق در جوق حلقہ جگوش لیگ ہوتے گئے۔ لیگی نظام تو معطل تھا ہی، جس شخص نے بھی مسلم لیگ کا "کلمہ" زبان سے پڑھا یا وہ اس کی "جنت" میں داخل ہو گیا۔

مسلم لیگ کی حیثیت، جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے، یہ ہے کہ وہ وزارتوں (حکومتوں) کی محاسب ہو اور حکومتیں اس کے سامنے جوابدہ ہوں۔ اس لئے جن دو طبقوں کا ہم اوپر ذکر کرتے ہیں، ان ہر دونوں نے جماعت کو اپنی اغراض کا آلہ کار بنانے میں ایٹری جوئی تک کا نور لگایا۔ اربابِ حکومت کو یہ ترود تھا کہ اگر ان کے مخالفین جماعت پر قابض ہو گئے تو ان کا سفر پر صعوبت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ سامعی رہے کہ مسلم لیگ میں وہ حضرات منتخب ہو کر آئیں جو ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی بجائے ان سے اغراضِ بریں، بلکہ جن کی آڑ میں وہ اپنی حکومتوں کو مستحکم کرنا لیں۔ اس کے برعکس دوسرے یعنی غیر وزیرِ گروہ نے شبانہ روز کوشش صرف کر دی کہ مسلم لیگ میں اکثریت ان کے ہم خیالوں اور حکومت کے مخالفین کی ہو تاکہ وہ اکثریت کے دباؤ سے وزارت کو اپنے حشمِ بابر و پرِ قص کر سکیں۔

اس اجمالی عموماً تبصرہ کی روشنی میں دیکھئے کہ مختلف صورتوں میں دونوں گروہوں نے کیا کیا کارہائے ناپیل کئے اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کو کن خطوط پر منظم کیا۔ صوبہ سرحد سے شروع کیجئے۔ سرحد کا وہ پرغوش و مخلص طبقہ جو پاکستان میں سلطانی جہور کے خواب دیکھ رہا تھا، مسلم لیگ نے اس کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ انتخابات اور استصواب میں تو مسلم لیگ نے ان کے دلوں پر نگاہ رکھی لیکن جب ان کو شریکِ حکومت کرنے کا وقت آیا تو مسلم لیگ نے حسبِ عادت انھیں نظر انداز کر دیا۔ حکومت کے موجودہ تصور سے یہ طبقہ عوام یوں بھی متفرقت اور تنہ حکومتی اداروں میں کسی قسم کی رسائی کا چنداں متعمی نہ تھا۔ ان کا تقاضا ایک عادلانہ انداز حکومت کا تھا جو انھیں اظہارِ پرورشِ خودی کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے۔ وہ کسی طبقہ کے تسلط کا اسٹامفالٹ نہ تھا جتنا عوامی ترفیح کا طالب۔ مسلم لیگ کے حالیہ انتخابات میں اس طبقہ کو طاقِ نسہاں کا گلہ سہہ بنا دیا گیا۔ مسلم لیگ کا کہنا ہے کہ ابتدائی ارکان کی بھرتی کئے چھ لاکھ میناق ہائے رکنیت صوبہ سرحد میں تقسیم ہوئے۔ چھ لاکھ فارم تو ایسا کار نہایا نہیں۔ صوبہ سرحد کی آبادی اس سے سات گنا زیادہ ہے۔ عوامی طبقہ نے احتجاج کیا اور مزید فارموں کیلئے شور مچایا مگر انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ مزید فارم موجود نہیں۔ یہ وجہ قابلِ تہیروائی ہو سکتی ہے کہ فارموں کے محدود ذخیرہ میں سے غیر محدود فارم نہیں دیئے جاسکتے لیکن امیدوارانِ رکنیت کو یہ آزادی تو دی جاسکتی تھی کہ وہ از خود فارموں کی نقلیں بنالیں اور ان کی خانہ پری کر کے رکنیت کی کوشش کریں۔ رکنیت کے لئے لیگ کا چھپا ہوا فارم تو ناگزیر شریٹ نہ تھی۔ دیا فارم تیار کیا جاسکتا تھا اور اسی مصرف میں لایا جاسکتا تھا۔ جہاں تک شہر چھ لاکھ فارموں کا تعلق ہے وہ چند منتخب آدمیوں کے ہاتھوں میں دیئے گئے اور منتخب آدمیوں کو ابتدائی رکن بنا یا گیا۔ محض یہی نہیں کہ فارم

مخصوص صنفوں میں تقسیم ہوئے بلکہ فارموں کی تعداد کے مقابلہ میں بہت کم رکنیت کا چندہ وصول کیا گیا، بہت کم وصول کرنے کی کوشش کی گئی۔ رکنیت کا چندہ صرف گنتی کے سر پر آوردہ حضرات سے وصول کیا گیا۔ چنانچہ اس طرح جزا انتخابات ہوئے وہ بقول شخصے نامزدگیوں سے زیادہ رقیع نہیں۔ یہ نامزدگیاں ان حضرات کی طرف سے ہوئیں جن کے اعمال کی مناسب نئی مسلم لیگ بننے والی ہے، ہم اس اصولی بحث میں شخصی تنقید میں الجھنا نہیں چاہتے لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ مسلم لیگ نے سابقہ غلطیوں سے مطلقاً کوئی سبق حاصل نہیں کیا یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ صورتِ سرحد کے انتخابات کی نگہداشت کا فریضہ اب کے بچر قاضی عیسیٰ صاحب کے سپرد ہوا۔ قاضی صاحب کی ذات گرامی سلسلہ ۱۹۷۵ء کے عمومی انتخابات میں اسی خدمت پر مامور ہوئی تھی اور سرحد میں مسلم لیگ کو شکست کھانا پڑی تھی۔ اب شکست کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کسی حریف سے مقابلہ ہی نہیں۔ لہذا عام طور پر یہ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ قاضی صاحب کی تخم ریزی کے ثمرات کیا ہوں گے؟

سرحد کے بعد مغربی پنجاب کو لیجئے۔ اس اہم ترین اور علی قدر تناسب پر قسمت ترین صوبہ کی عنان وزارت ممدوٹ صاحب کے قبضہ میں ہے۔ ممدوٹ صاحب نے حال ہی میں اعتراف کیا ہے کہ قائد اعظم نے ان کو صوبائی وزارت عظمیٰ کے لئے نااہل قرار دیا تھا۔ اس بطل بزرگ کی اس قطعی سند کے باوجود آپ محض وزارت سے چپکے ہوئے ہی نہیں بلکہ ان کی تنگ دوڑ کا محور یہی کچھ ہے کہ ان کی وزارت بحال رہے امدان کے جی حضور ی ان کے گرد جمع رہیں میاں ممتاز دولتانہ کبھی ممدوٹ صاحب کے شریک وزارت تھے لیکن پھر اس رفاقت سے دستکش ہو گئے۔ جب آپ دونوں اشتراک وزارت کے مجاہد نہیں تھے تو بٹانگہ دل اعلان فرمایا کہ تھے کہ ان کی وزارت بہترین وزارت ہے اور صوبہ کی صحیح خدمت گنارہ لیکن جب دولتانہ علیحدہ ہو گئے تو ان کے نزدیک وزارت نااہلوں اور نا تجربہ کاروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ ممدوٹ صاحب نے عدم کارگزاری کی ذمہ داری دولتانہ صاحب کے سر تقویٰ اور دولتانہ صاحب نے ممدوٹ صاحب کو مورد الزام قرار دیا۔ دونوں کی الزام تراشی سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وزارت وہی صلی جس میں صاحب بیان شریک ہو۔ اس سیاسی رسد کشی میں صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات برپا ہوئے۔ دونوں نے مسلم لیگ کی خالی نشستوں پر لٹیچائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ صوبائی انتخابات اصول اور مقاصد کی اساسات پر نہیں ہوئے بلکہ شخصی اور ذاتی رجحانات پر۔ دونوں گروہ دولتانہ دار زیریں اور ابوالائی اوار سے فتح کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کس قسم کے اخلاق عالیہ اور اوصاف حمیدہ کا مظاہرہ کیا؟ یہ موقع اس شرمناک داستان کے چھڑنے کا نہیں۔ صوبائی انتخابات کا رخ از بسکہ ضلعی انتخابات سے متعین ہونا تھا اس لئے بڑی بڑی توپوں کے دہانے ضلعوں کی طرف پھیر دیئے گئے۔ اس مقابلہ میں صاحب اقتدار پارٹی مات کھا گئی اور وزارت سے نکلے یا نکالی ہوئی پارٹی کی جیت ہوئی۔ عوام نے اس دلخراش ڈرامے میں کیا پارٹ اور کیا؟ اس کا قیاس ذرا مشکل ہے۔ رائے عامہ نہ ہونے سے عوام بمنزلہ صفر ہیں ان کے ووٹ بوقت ضرورت حسب منشا حاصل اور استعمال کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بدستور سابق رائے اور بے رہتے ہیں۔ وہ سارے کو چھوڑ کر چاند کو سجدہ کرتے ہیں لیکن رب مقصود

ان کا نہ وہ ہوتا ہے نہ یہ۔ وہ بے زبان ہیں اور بے بس۔

اب مغربی پنجاب کی یہ کیفیت ہے کہ وزارت مموٹ صاحب کے ہاتھ میں ہے اور صدارت دو ٹانہ صاحب کے ہاتھ میں۔ ایک وزیر اعظم ہے، دوسرا وزیر برہمچاک ہے اور وزیر اعظم بننے کا حریص۔ ایک کی کوشش یہ ہے کہ دوسرے کو وزارت سے جائز و ناجائز ذرائع سے بے دخل رکھا جائے، چنانچہ اس نے جماعت کو پوری طرح جی حضور یوں کے تسلط میں لانا چاہا۔ گونا گوار کام رہا۔ دوسرے کی کوشش یہ کہ وہ اپنے حریف کو نچا دکھائے اور خالی نشست پر خود قابض نہ ہوجائے۔ چنانچہ اب وزارت اور صدارت میں استخوان نزاع حکومت ہے۔ وزارت حکومت برقرار رکھنا چاہتی ہے اور صدارت حکومت چھیننا چاہتی ہے۔ صوبے کا اٹنہ مالک! مہاجرین کی بجالی، عوام کی مشکلات کا حل، صنعتی ترقی، ملکی رفاع و مہبود، انفلاس اور صوبہ کو کا علاج، وغیرہ مسائل ہم طاق نسیاں کی زینت ہیں۔ اس ادھر توجہ میں ادھر توجہ دی ہی نہیں جاسکتی۔

بینہ اسی قسم کا کھیل سندھ میں کھیلا گیا۔ سندھ کے سابق وزیر اعظم مشر کھوڑو کے خلاف متعدد الزامات ہیں جن کی سماعت سپیشل ٹریبونل کے سامنے ہو رہی ہے۔ ٹریبونل کے فیصلے سے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، فیصلہ تک مشر کھوڑو کی پوزیشن ظاہر ہے۔ مگر اسی عالم میں معرکہ انتخاب برپا ہو گیا۔ چودہری خلیق الزماں صاحب نے اپنے بیان کے مطابق مشر کھوڑو کو مجبور کیا کہ وہ صدارت کے سٹے دکھڑے ہوں۔ وہ رضامند ہو گئے۔ کاغذات نامزدگی داخل ہو رہے تھے اور آخری وقت قریب تر آچکا تھا کہ وزارتی پارٹی نے اپنے نامزدے کے کاغذات داخل کر دیئے۔ مشر کھوڑو یہ گوارا نہ کر سکے۔ وہ خلیق الزماں صاحب کے باز رکھنے پر بھی بضد رہے اور اپنے سابقہ فیصلہ کو بدل کر انہوں نے اپنے کاغذات داخل کر دیئے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو کھوڑو صاحب صدر منتخب ہو چکے تھے اور بھاری اکثریت سے۔ چودہری صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مشر کھوڑو کو تبدیلی فیصلہ سے باز رکھ سکے۔ لیکن اگر چودہری صاحب سے پوچھا جائے کہ جب وہ مشر کھوڑو پر دباؤ ڈال کر انہیں باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو انہیں یہ کیوں خیال نہ آیا کہ وزارتی پارٹی کو ہی اس اقدام سے باز رکھا جائے۔ وزارتی پارٹی کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا تھا کہ وہ جماعت کو اپنے نامزدے کے قبضہ میں لانے کی کوشش کرے۔

چودہری صاحب کے اصول کے مطابق اگر لیگ کے عہدہ داران کا ان حکومت نہیں ہو سکتے تو وزارتی پارٹی کے ارکان عہدہ پر کیسے مسلط کئے جاسکتے ہیں؟ یا ان کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ مسلم لیگ کے عہدوں کو اپنے نامزدگان سے پر کریں اور یوں جماعت کی بیخبری حضور یوں کی جماعت میں تبدیل کر لیں؟ اب مشر کھوڑو کے اقدام پر لاکھ طنن کیجئے، وزارت اور ناظم مسلم لیگ کے رویہ کو کیسے بنظر استخمان دیکھا جاسکتا ہے؟ کیا وہ اس افسوسناک نتیجہ کے باعث نہیں بنے؟ اب ہر چند مشر کھوڑو صدارت سے از خود مستعفی ہو گئے ہیں لیکن مجالس عاملہ وغیرہ ان کی نامزدگی ہے۔ اگر مشر کھوڑو از خود مستعفی نہ ہو جاتے تو صدارت دو وزارت دو حریف گروہوں کے قبضہ میں ہوتیں۔ یہ دونوں گروہ کبھی مساوی نہ ہو سکتے۔ اور صوبہ اور ملک نتیجہ کے طور پر نقصان اٹھاتے۔ ان کے استعفیے سے اس فتنہ کی سرکوبی ہرگز

نہیں ہوتی۔ جو شجرۃ الزقوم بوجا چکا ہے اس کا پھل چکناہی پڑے گا۔

مشرقی بنگال کی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں اور میں افسوس ہے کہ ہم ان خود مطلوبہ معلومات مہیا نہیں کر سکیے وہ صرف بظاہر منارت اور 'صدارت' کی بمیانک جنگ سے محفوظ نظر آتا ہے لیکن وہاں ایک حقیقی خطرہ ہے جسے خصوصیت سے نگاہ میں رکھنا پڑے گا۔ یہ خطرہ کیونزوم کا ہے۔ بنگال ایسے باغیوں کا گہوارہ رہا ہے۔ مشرقی بنگال کے گرد و پیش کیونزوم کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ہندوستان، برما، چین، ملایا، جزائر شرق الہند وغیرہ علاقوں میں کیونزوم آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھوٹ رہی ہے۔ خود خلیق الزماں صاحب کو اس ضمن میں شکایت ہے کہ مشرقی بنگال میں اشتیالی طبقہ مسلم لیگ میں تشنت پیدا کر کے اور اس کی جمعیت کو پریشان کر کے اپنے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔ اشتیالیت میں الاقوامی سیاست کا سنگین مسئلہ ہے۔ پاکستان میں اس کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی گئی اور صرف اس قدر کہہ کر نال دیا جاتا رہا ہے کہ مشرقی بنگال میں اشتیالیت اثر و نفوذ پیدا نہیں کر سکی، نیز اسلام کا مقابلہ اشتیالیت کرنا ممکن ہے۔ یہ لفظی طفل تسلیم اور فوش خیالیاں کسی وقت خلاف حقیقت ثابت ہو سکتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں اشتیالیت میں برق رقاری اور ناقابل شکست طریق سے تسلط جا رہی ہے اس کا مقابلہ الفاظ و امالی سے نہیں ہو سکتا۔ اشتیالیت اپنے جلو میں کیا تبدیلیاں لاتی ہے؟ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن وہ تبدیلیاں ہو سکتی ہے ہمارے خواہش کے خلاف ہوں اور بالکل ناگہانی وقوع پذیر ہو جائیں۔ خود مسلم لیگ کے حرم عافیت تک ان دوسرے شعلوں کی حرارت پہنچ چکی ہے لیکن..... فضلی استخفاف پر بات ختم کر دی گئی جو مشرقی بنگال کی نئی مسلم لیگ اشتیالیت کے امکانات کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتی۔

صوبوں کی حدود سے نکل کر اب ذرا عمومی فضا میں آئیے۔ ۱۹۴۵ء کے قانون ہند کے نفاذ نے ہندو کانگریس کو جو غلبہ اور تسلط بخشا اس سے مسلمانوں کے سامنے یہ اہم مسئلہ آ گیا کہ اگر کانگریز اقتدار سے دستکش ہوا تو ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا مستقبل ہوگا؟ اقتعال اقتدار کے بعد ان کی کیا حیثیت ہوگی؟ حکیم الامت کا عطا فرمودہ تصور موجود تھا اور قائد اعظم ایسا مدبر اس میں رنگ بھرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ ایک کے تصور اور دوسرے کی جدوجہد نے پاکستان بنا دیا۔ عوام اس جدوجہد میں شریک ہوئے تو محض ہاتھ کھڑا کرنے کے لئے۔ وہ تقسیم کے نتائج کے لئے تیار نہ ہو سکے، چونکہ مسلمانوں کی نام نہاد زندگی ایک سیاسی شعبہ سے متعلق تھی اس لئے سیاست کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور ہر شعبہ پر سائنسین چھا گئے۔ ہمارے ان نام نہاد سائنسین کا طائفہ مشتمل تھا ان حضرات پر جو مطالبہ پاکستان سے پیشتر کی جنگ آزادی میں خوار و بول ہو کر اپنے گھر لوں میں دیک کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اجنبی حکومت کے نزدیک قابل عزت رہا تھا، ملت کے نزدیک واجب الاحترام یا واجب الاتباع۔ بات کسی شعبہ سے متعلق ہو اس کی قیادت اسی طبقہ کو سونپ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس دستور ساز اور مجالس مقننہ میں مسلمان ماہرین آئین و قانون نہیں آئے بلکہ محض ارباب سیاست۔ محض ہی نہیں بلکہ ایک شخص بیک وقت متفرق اداروں کا رکن بنا دیا گیا۔ مثلاً ایک صاحب صوبائی لیگ کے صدر بھی ہیں اور وزیر اعظم بھی، وہ صوبائی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں اور مجلس دستور ساز کے بھی۔ پنجاب میں دو تانہ صاحب

کو ایسے وہ صوبائی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں اور صوبائی لیگ کے صدر بھی۔ یعنی ایک طرف تو انہیں جماعت نے عزت انتخاب بخشی، دوسری طرف وہ رکن مقننہ ہونے ہوئے وزارت کے مفدا بھی ہیں۔ یعنی وہ دو کشتیوں کے سوار ہیں اور مکلف نہیں کہ کسی ایک کشتی کی سواری چھوڑ دیں۔ چونکہ وزارت میں اقتدار کی مزید لکھی ہے اس لئے جو صاحب صدارت پر قابض ہوں گے وہ قدرتی طور پر اس دباؤ اور اثر کو حصول وزارت کے لئے استعمال کریں گے اور اس حصول کا قدم اول موجودہ وزارت کی تبدیل ہوگا۔

چودھری خلیق الزماں صاحب ناظم مسلم لیگ نے ۱۶ جون ۱۹۶۸ء کو فرمایا تھا:

ہم مسلم لیگ کی ایسے خطوط پر تنظیم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے عہدہ دار مجالس مقننہ کے لئے منتخب نہ ہوں۔

یہ اصول تو وضع کر لیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد ہرگز نہیں ہوا۔ اگر یہ مسلم ہے کہ مسلم لیگ کے عہدہ دار مجالس مقننہ کے رکن نہ ہوں تو اس کا الٹ بھی مسلم ہونا چاہئے کہ مجالس مقننہ کے ارکان کو مسلم لیگ کے عہدہ دار نہیں ہونا چاہئے۔ اس پر مطلقاً عمل نہیں کیا گیا اور نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو جماعت اور حکومت کے دائرے مختلف رہتے اور یوں خلط ملط ہو کر مزید فساد کا باعث نہ بن جاتے۔ یعنی اگر ایک صوبائی صدر کو یہ معلوم ہو کہ وہ جماعتی ضوابط کے ماتحت وزارت پر حریص نگاہیں ڈال سکتا تو وہ منتخب ہونے سے پیشتر یہ فیصلہ کرنے کا کہ اسے کون سے دائرہ عمل کو ترجیح دینی چاہئے۔ جب وہ ایک بار انتخاب کر لے گا تو اپنی تمام تر توجہ اسی دائرہ پر مرکوز اور اسی تک محدود رکھے گا۔ وہ دوسرے دائرہ میں ذہیل نہیں ہو سکے گا۔ اس سے یہ فساد و اغراض ایک حد تک کم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو فساد و تخریب کی صورت نام نہاد تنظیم جدید میں ہی ضمیر ہے۔ ایسے خطوط پر تنظیم ہونے والی جماعت کو وزارتوں اور عہدوں کی جنگوں اور سازشوں سے ہی فرصت نہیں مل سکے گی۔ چودھری صاحب نے مسلم لیگ کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ عوام اور حکومت کے مابین رابطہ کا کام دے گی۔ نیز مسلم لیگ مضبوط اور روشن ہوگی تو وہ حکومت کو رائے عامہ سامنے جھکا لے گی۔ یہ الفاظ علامہ مقدس خواہشات ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، ارکان مسلم لیگ ارکان مجالس مقننہ ہونے کے باعث وزارتوں پر حریص نگاہیں ہی نہیں ڈالتے بلکہ ان کے حصول میں دیوانہ وار سعی ہیں۔ یہ جماعت حکومت کو جھکا سکی تو عوام کے سامنے نہیں جھکائے گی بلکہ اپنے سامنے جھکا لے گی۔ عوام بے چارے دونوں کے سامنے جھکے ہوئے ہوں گے۔ حکومت قانون کے ذریعہ ان پر مسلط و حاکم ہوگی اور جماعت جذبات کے زور سے ان پر قابض۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ ایک ہر دلغزیر و مقبول نام تھا۔ یہ عزت و تکریم قیام پاکستان کے بعد ختم ہو گئی تو اب اس نام کا غلط استعمال ہوا ہے اور اس کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ انتخابات نے جوئی جماعت تیار کی ہے وہ بھان متی کا کنہ ہے۔ اس میں یا تو وہ افراد ہیں جو اپنے موجودہ اجاروں اور حاصل شدہ اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا وہ افراد جو ان افراد کو بے دخل کر کے خود ان پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ یہ جماعت دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کریگی لیکن عیب جوئی کی غرض سے اور اس نیت سے کہ ان کی کارگزاری میں تنم تلاش کر کے انہیں بدنام کیا جائے اور

اپنے لئے راستہ صاف کیا جائے، کیونکہ یہ راستہ ان کے لئے پرستور کھلا ہے۔

مسلم لیگ کا موقع حصول پاکستان تھا۔ اب جبکہ پاکستان حاصل ہو چکا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے عزائم و مقاصد کیا ہیں۔ محض یہی نہیں کہ اس کے عزائم و مقاصد کیا ہیں بلکہ اس کا طریق کار دلائل تک عمل کیا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ ایک نئی جماعت ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھر گی۔ لیکن اس نے کبھی یہ بھی تو نہیں بتایا کہ پاکستان کا خاکہ کیسا ہے۔ یہ بتانا کوئی معمولی بات نہیں اور اس سے اہم نتائج۔ خانہ اور ناخانہ دونوں۔ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں جو دہری خلیق الزماں صاحب نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مسلم لیگ نے جماعتی حیثیت سے کبھی مسلمانوں سے اسلامی حکومت کے قیام کا وعدہ نہیں کیا۔ اگر یہ کچھ کہا جاسکتا ہے تو پاکستان کے خاکہ کی تو بشارت تو وہیں ہو سکتی ہیں۔ لہذا استحکام پاکستان وغیرہ قسم کی نظر فریب اصطلاحات بہم ہیں اور سیاست میں بال کی کھال اتارنے والے لہنے ہر اقدام کو اس کے مطابق بتا سکتے ہیں۔ ان حالات میں اشد ضروری تھا کہ ایک سیاسی جماعت ہونے کی حیثیت سے مسلم لیگ اپنا پیش نهاد اور طریق کار تو قیام کے سامنے رکھتی۔ مرکزی جماعت کی کمی کو صوبائی جماعتوں سے ملکہ باغی صوبائی جماعتوں سے افراد۔ نے پورا کرنے کی سعی ضرور کی ہے۔ لیکن ایک تو ان کی حیثیت قدرتی طور پر تقاضی ہے، دوسرے وہ دعاوی بہت بلند بانگ ہیں اور غیر معمولی عمومیت اور حسین ایہام کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں عمومی اعتبار سے یہی کچھ کہا گیا ہے: پاکستان کا دفاع ہوگا، کشمیر کا دفاع ہوگا، فساد انتظام دوزخ ہوگا وغیرہ۔ یہ عنوانات خوبصورت ہیں لیکن الفاظ کمال حسن و رعنائی و شکوہ، حقیر سے حقیر عمل کا بدل نہیں ہو سکتے۔ عوام کی مشکلات حقیقی ہیں اور اقتضات طبعی سے عبارت ہیں۔ خالی جیب و شکم الفاظ سے پر نہیں ہو سکتے، لہذا الفاظ سے تن ڈھانپنا چاہتا ہے۔ مسلم لیگ یا اس کے نمائندگان کے مقاصد میں ان مشکلات اور ان کے حل کے عزم کا عدم ذکر اس کی غمازی کرتا ہے کہ قائدین لیگ کو یا تو ان مشکلات مہر کا علم نہیں یا وہ انہیں حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، یا ہر دو سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کا کعبہ مقصود صدارت ہو یا وزارت اور سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر

اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

مسلم لیگ نے اپنے نام Good Will سے فائدہ اٹھا کر اپنے انتظامات کو کر کے، لیکن یہ فائدہ دراصل مسلم لیگ نے نہیں اٹھا یا بلکہ اتنے وقت نے مسلم لیگ کے نام کو اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کیا ہے، اور جماعت اور ملت دونوں کو بوقوف بنایا ہے۔ تاہم مسلم لیگ نے مطلقاً اس امر کی کوشش نہیں کی کہ نئی جماعت ناخاندہ عناصر سے پاک رہے یا شخصی کام جو بیوروں کی آماجگاہ نہ بنے۔ مسلم لیگ یقیناً اس کا خیزا رہ جکتے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ وقت تک یہ عرصوں نہ ہو کہ اس سماز پر کتنے تحریقی عناصر جمع ہو گئے ہیں لیکن دشمن کا ایک ہی وار پڑا تو دفاعی خط میں بلکہ ماہ شاگرد بن جائیں گے۔ اس وقت مسلم لیگ پرانے زور میں چلی جا رہی ہے۔ وہ توانائی ایک نہ ایک دن ختم ہوگی۔ اس کے بعد جماعت کو نئی قوت و توانائی سے آگے بڑھنا ہوگا، یہ قوت اور توانائی خارج سے نہیں آئے گی بلکہ اندرونی صلاحیت سے اس کا چشمہ پھوٹے گا۔ اس وقت مسلم لیگ میدان مقابلہ میں رہ جائیگی۔

اب تک ارباب حکومت کے انداز سے یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک یعنی مسلم لیگ کے علاوہ کسی دوسری سیاسی پارٹی کے روادار نہیں ہوں گے۔ حال ہی میں وزیراعظم پاکستان نے مجلس دستور ساز میں اعلان کیا ہے کہ دوسری پارٹیوں کو بھی عام اذن تشکیل حاصل ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت ملک کے صحیح تحفظ کے لئے یا اپنی پارٹی کے اقتدار کی برقراری کے لئے دوسری پارٹیوں کی تنظیم و مہم گیری پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے، لیکن اگر کسی حزب مخالف نے عوام کی مشکلات کے حل کا دم بھرا اور نسبتاً خلوص اور قوت سے عوام کی موافقت میں قدم اٹھایا تو عوام اس حزب کو سزا نگہوں پر بٹھائیں گے اور یہ صحیح قلب اس کے پیچھے ہوئیں گے۔ اس سیلاب اتباع کا ہوا تو ایک دفعہ بدل گیا تو کشت لیگ بے آب و گیاہ بن جائے گی۔ احزاب مخالف موقع کی تلاش میں ہیں، مواقع کی کمی نہیں مسلم لیگ کے ہاتھوں پتے ہوئے مہر بیروپ بدل بدلی کر آئیں گے۔ ان میں ابھی سے زندگی کے آثار بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کے نئے روپ زیادہ دلکش اور نظر فریب ہوں گے۔ وہ مسلم لیگ سے پورا انتقام لیں گے۔ مسلم لیگ خود بخود اپنی موت کے سامان تیار کر رہی ہے۔ مجلس دستور سازی رفتار از حد سست ہے۔ نئے انتخابات دستور کی تدوین بلکہ تنفیذ کے بعد ہوں گے اور ابھی اس کے لئے کافی عرصہ درکار ہے۔ مسلم لیگ حکومت جن غیر معمولی مسائل سے دوچار ہو اراکان مسلم لیگ بوجہ انھیں کا حقہ حل نہیں کر سکتے۔ وہ عوام کا اعتماد سرعت سے کھو رہے ہیں۔ نئے انتخابات میں ہنز بہت دیر ہے۔ اس وقت مسلم لیگ حکومت عوام کا رہا سہا اعتماد بھی کھو چکی ہوگی۔ احزاب مخالف کھلنے والے وہ سنہری موقع ہوگا۔ اس سیاسی نیلام میں جس بے قابو زبان نے بڑھ کر بولی دے دی وہ متاع ملت کا سودا کر لے گا۔

ایسے میں مسلم لیگ کا جو حشر ہوگا، سو ہوگا۔ جماعتیں ابھرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ قابل غور سوال یہ ہے کہ اس انتشار میں ملت کا کیا بنے گا؟

ملت کے سامنے دو سوال ہیں۔ اگر مسلم لیگ بائیں ترکیب تنہا میدان سیاست کی یکہ تازدی تو اس کے ہاتھوں نظام سیاست میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا کیا مداوا ہوگا۔ اور اگر اس کی دیکھا دیکھی ایسے احزاب مخالف میدان مقابلہ میں آگئے جن کے عزائم مشتبہ ہوئے تو اسے ان کی منفرت سے بچنے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ دونوں صورتوں کی مضرت ظاہر ہیں۔ کیا تدبیر و تدبیر اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ مضرت پہنچ چکنے کے بعد اس کے علاج کی تدبیر سوچی جائے؟ اگر فقط مقدم ضروری ہے تو ملت کو ابھی سے ان نتائج برسرے بچنے کی سبیل سوچنی چاہئے۔ طلوع اسلام اس ضمن میں اپنی رائے دے چکا ہے۔ ملت ایک ہمہ گیر پارٹی ہے۔ اس کی تقسیم و تقسیم، خواہ کسی بنا پر ہی کیوں کی جائے فساد کا باعث ہوگی۔ ان تباہ کن نتائج سے بچنے کی واحد صورت اقاتے احزاب ہے۔ تعدد احزاب اجتماعی ہلاکت ہے۔ ملت میں کسی پارٹی کی گمنامی نہیں خواہ وہ پارٹی مسلم لیگ ہی کی کیوں نہ ہو۔ جب ایک پارٹی کو گوارا کیا جائے گا تو پھر ہر پارٹی کو گوارا کرنا ہوگا۔ اور اس کا نام انتشار ہے اور نتیجہ فساد۔

معارف القرآن

(تعارف)

ہمارا دور اس اعتبار سے برفروش بحث ہے کہ اس میں قرآن کی طرف مراجعت —
 (Back to Quran) کا خیال عام ہو رہا ہے۔ اس مبارک و
 معبود گوشتش میں ہمارے محترم جناب پروفیسر صاحب کا حصہ بڑا نمایاں ہے انہوں نے فی الحقیقت
 اپنی زندگی کا ایک ایک ناصع لمحہ قرآن پر غور و فکر اور پھر اس مورد فکر کے نتائج کی اشاعت کے لئے
 وقت کر رکھا ہے۔ اس باب میں، ان کے خطبات، مذاکرات، مضامین اور تقاریر کے علاوہ،
 ان کا مستقل کارنامہ جسے اللہ تعالیٰ یقیناً بقائے دوام عطا کرے گا۔ ان کی مایہ ناز تصنیف
 معارف القرآن ہے۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان عظیم یاخیزہ طبقہ کے قلب نگاہ میں
 صحیح اسلامی انقلاب پیدا کر دیلے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے ہر ایک گھر میں موجود ہونا چاہیے۔
 تاکہ اسے سبقاً سابقاً بطور درس پڑھا اور پڑھایا جائے۔ چونکہ طلوع اسلام میں اس کتاب کا ذکر
 آتا رہا ہے۔ اس لئے ہمارے پاس اکثر انفسارات آتے رہتے ہیں۔ جن میں اس کتاب کے
 تفصیلی تعارف کا تقاضا ہوتا ہے۔ ان استفسارات کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے اس
 ہم نے اسے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا تعارف خود اس کتاب ہی سے کر دیا جائے۔ کتاب کی
 تین جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی جلد جو تہ کار جلیلہ حضور سرور کائنات پر
 مشتمل ہے، پڑیں میں جاری ہے۔ ہر جلد ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ پہلی
 جلد کے مقدمہ میں کتاب کی ترتیب و مقاصد کا تعارف ہے۔ اور دوسری اور تیسری جلد کے
 مقدمات ہیں۔ ان مختار یک درجہ جانات پر تبصرہ جنہاں کے پیش نظر آج دنیا کو قرآن کی حزن مزہ
 ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے التزام کیا ہے کہ ہمارے انور اسلام کے نفاذ کے شوقین
 مسکین کے لئے ان مقدمات کو شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ ذیل میں جلد اول کا مقدمہ بہ مسرت
 شائع کیا جاتا ہے۔ باقی دو جلدوں کے مقدمات اس کے بعد شائع کیے جائیں گے۔ دعا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ جناب پروفیسر کو فرصت عطا فرمائے کہ وہ اس عظیم القدر کام کو جرنی اختتام

جماعت کے کرنے کا حقا، پانچ تکمیل تک پہنچا دیں۔ یہ تو تھا قرآن عتیق سے جو انہیں اس قدر
ہمت دینے ہمارے ہے۔ درمیان کی زندگی کی مصروفیتوں کو دیکھ کر کئی واقعہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ
اس کام کے لئے کہاں سے وقت نکال لیتے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

۴۱۔ طوح اسلام

خاک ماخیزد کہ سادو آسمانے دیگرے

ذره ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

کائنات کی ہر شے ایک نئے بندے قانون کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے رت کے ذرے سے بیکر
عظیم انسان کرۂ ارض تک۔ ایک کرۂ ارض کیا اس کرۂ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج تسلیم ہے؟ پھر اس
نظام شمسی جیسے لاکھوں اور اجرام مادی، سب ایک معینہ قاعدے کے مطابق اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔
اگر زمین اپنے راستے سے کبھی ایک اپنی بھی اوجر اوجر مت جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی پیدا کر لے
اگر یہ ایسے ریح کو غمزدہ زمین کے لئے۔ خلافت مضابطہ جل لیں۔ اگر پانی اپنی نظرت کے کفایت نشیب کے بجائے فراہمی
طوت پہنچے لگ جائے۔ فرضیکہ اس میں اعتدال کا لگ عالم کا کوئی ایک ہرزہ اپنے نظام سے مرتانی اختیار کر لے۔ زیر عظیم انشا
سلسلہ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں، دنیا اور اس کی جہلندت آفرینیاں اس بنا پر قائم ہیں
کہ نظرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ **رَسْمُکُمْ نَبْوُحَاتِی الْمَسْفُوتِ وَالْأَرْضِ** (ہا
حیرت خاندان اور ذرہ ذرہ کا ایک ایک ذرہ اپنے دائرہ عمل میں پوری مستعدی سے اہانت کو شہ ہے **وَاللَّهُ لَشَیْئِدٌ**
مِّن فِی السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) ہر شے اس کے قوانین کے سامنے سجدہ دینے ہے **رُکِّنْ لَهُ فَاَتَمُّوْنَ**)

جب عالم موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانون زندگی اور مضابطہ حیات متعین ہے تو
قانون فطرت انسانی **قانون فطرت انسانی** جو اس خطہ ارض پر سلسلہ ارتقا کی آخری گڑھی اور نظم کائنات کا حسین قطع
ہے اس ضبطد آیت سے سنٹی ہو گا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام کائنات کے خلات ہو گا جب کائنات کی ہر شے ایک
خاص ہیج و اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص مضابطہ حیات کے
مطابق دنیا میں ہے۔ وہ قانون حیات جس کے مطابق زندگی بسر کرنا انسان کے لئے تقاضا ہے فطرت ہے، اسلام کہتا

فَطَرَتْ اَللّٰهُ الَّذِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِلُ مِثْلَ خَلْقِ اَللّٰهِ ذٰلِكَ الَّذِیْنَ اَلْقَمِمْ
وَلٰكِنْ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

خدا کا وہ قانون فطرت جس کے مطابق اس نے نوع انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کے قانون خلق

میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی دین حکم ہے لیکن اکثر لوگ اس عظمت کو نہیں سمجھتے

یہ آئین و ضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا تھا انسان نے نظرت انسانی ہے۔ خدا کی طرف سے بڑی بیداری انسانوں تک پہنچے رہے۔ پس سلسلہ ذہن انسانی کے عہد طفولیت سے اس کے تصنیفیت کے مطابق بڑھتا ہوا سالا پاتا رہا۔ تا آنکہ انسانیت اپنے عہد شہاب تک پہنچی۔ یہاں اس سلسلہ کی تمام منشر کردہ یوں کو یکجا کر کے اور نظرت انسانی کے انتہائی تحقیقات کو سامنے رکھ کر ہرگز ایسی ہی سے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات عطا ہوا جو قیامت تک کے لئے قرآن کی وفتین میں مضمون ہے۔ اس لئے اگر آج کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ وہ کونسا قانون زندگی اور نظام حیات ہے جو نظرت انسانی کے مطابق ہے تو اس کا ایک اور صورت ایک جواب ہے کہ وہ ضابطہ حیات قرآن کریم ہے۔ دنیا جب اس نفاذ کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو اسے اسلوب کا نام ہادہ امتداد یا صراطِ مستقیم دینا ہو گا۔ اور جب اس کے خلاف چلے گی تو اسے فساد یعنی غیر نظری زندگی کہا جائے گا۔

اسلام جو حکم دین نظرت ہے اس نے اس کی تعلیم ایسی سادہ اور سیدھی **قانونِ نظرت کی سادگی وہ سختی** دل میں اتر جانے والی اور اس کے ہمت اصول۔ قوانین نظرت کی طرح ایسی حکم اور فیض تبدیل بنیادوں پر قائم ہیں کہ انہیں قبول کرنے میں ذہن انسانی کو اور ان پر عمل پیرا ہونے میں قلب ہر طرح کو نظرت انسانی کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑے گی بلکہ عین نظرت ہونے کی وجہ سے نظرت انسانی سے اپنا ہم آہنگ ہائے گی۔ لیکن جس تعلیم کو اب عام طور پر اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے۔ وہ لائیکل سہاقت۔ دوا زکار مسائل اور پتہ تہہ روم و نظائر کا ایسا گورکھ و مندر ہے کہ اسے قبول کرنا تو درکنار اس کے سمجھانے کی ہر کوشش اس کے ابھار کو عہدہ زکروقتی ہے۔

دینِ نظرت کی حقیقی روح **دینِ نظرت کی حقیقی روح** دینِ نظرت کی حقیقی روح ہیں قرن اولیٰ میں نظر آتی ہے۔ جب دماغی کا تمام نظام نظرت کے عین و سادہ خطوط پر مشتمل ہو چکا تھا اور ہر عین سادہ کا درخشندہ نتیجہ تھا کہ اسے آج تک۔ لیکن وہ دور عمل۔ وہ مہاراجہ خدا پرستی کا زمانہ عہد گزشتہ۔ خلافتِ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور رشتہ رشتہ ملوکیت کی تمام ہلاکت آفریں خرابیاں اور عجیب تکلفات اسلامی تمدن پر چھا گئے۔

یوں تو ملوکیت کی ابتدا جی امین کے زمانہ سے ہو گئی تھی۔ لیکن عہد عباسیہ میں اسلامی روح پر عبثیت **عجیب اثرات** اس درجہ غالب آگئی کہ اس کے نظریہ دوزنگار نقابوں کے اندر دستور و عرصہ سمیت کا سراغ بشکل مناسب عہد دور ہائے علمی کا زمانوں کا درخشندہ عہد ہے اس عہد میں یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا۔ اس لئے ان کے اندر تصنع و ترقی میں ریلو و ضبط۔ قائم کرنے کے لئے ذہب و داستان بنے۔ فرصت کارمانہ۔ فراغت کے دن رفتہ رفتہ سیرتِ محمدی کی شمشیر و سنان کی دلولہ انگیزہ بال بھی تہذیب کے عطا و س درباب کی شرح نیز یونان میں تبدیل ہو گئیں۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو قرآن کے علمائے متفصل ہو گئے اور دوسری طرف اسلام کی نظری تعلیم صحیحی تصورات کے پردوں میں چھپ کر فلسفیانہ تہذیب گزشتہ اور معصوم و روایت کی توہم پرستیوں کی نذر ہو گئی۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثت مقدسہ کا مقصد عظیم بتایا ہے **وَيُضَمُّ عَلَيْهِمْ رِضْوَانٌ مِّن رَّبِّهِمْ** یعنی حضورؐ ان طرف سے اس

تو ذکر پھینک دیں گے جن کے پٹے انسانیت دینی بھی آتی تھی۔ ان طوق و سلاسل کی نوعیتوں میں کتنا ہی اختلاف اور شکل و صورت میں کیسا ہی تفاوت کیوں نہ ہو، حقیقت کے اعتبار سے ان کی دو ہی قسمیں ہیں، ملکیت اور برہنیت یعنی خدا اور بندے کے درمیان دوسری قوتوں کا حامل ہو جانا۔ ملکیت انسانوں سے اپنی عبودیت چاہتی ہے اور برہنیت خدا اور بندے کے درمیان وسط بنتی ہے۔ اسلام کی حقیقت کشا تعلیم اور نبی اکرم کے مدغم انظیر عمل نے ان دونوں غیر فطری قوتوں کو بڑھتے اگیئر پھینکا اور یہ طوق و سلاسل مکر سے مکر سے ہو کر رہ گئے۔ لیکن بعد میں آنے والے مسلمانوں نے ان شکستہ زنجیروں کے بھروسے ہوئے جکڑوں کو پھرتے اٹھایا اور پہلے سے بھی جکڑ زنجیریں تیار کر کے خود اپنے ہاتھوں سے آپس میں اور اس کے بعد مرخ نفس آشنا کی طرح ان سے اپنے مانوس ہوئے کہ یہی پایہ زنجیر زندگی ان کی نگاہوں میں نظری آزادی کی حسین ترین شکل اختیار کر گئی۔ غور فرمائیے مسلمانوں پر صدیوں سے حکومت اور برہنیت کی غیر فطری قوتیں مسلط ہیں اور یہ ان سے اس درجہ جوگر ہو چکا ہے کہ ان کے خلاف اس کی صیدت کبھی ابا نہیں کرتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان زنجیروں کی طرح جہد یعنی اُمیت میں پڑی اور جہد عباسیہ میں یہ حکم دستور ہو گیا

زوال بغداد کے بعد صورت حالات ہستے بدتر ہو گئی۔ مرکزیت فنا اور امت ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو گئی۔ ہرزادیا اور ہر گوشہ، ہر منبر اور ہر خانقاہ عدا گانہ مرکز بن گئے۔ اب نہ دلوں میں وہ بجا ہوش تھا نہ نگاہوں میں قرآنی بصیرت۔ مشکل اندر مشکل کہ آگے بڑھتے تو ایران کے آشکدوں کی گری نفس اور حرارت سخن نے اس بقوت کو فردوس نگاہ بنا دیا جس کی روستہ دین انفرادی تزکیہ نفس اور ذاتی نجات کا ذوق بن کے رہ گیا اور وہ انتہائی اور مرکزی زندگی جس کا مقدس زمین پر حکومت اللہ کا تخت اجلال بھانا تھا نگاہوں سے اونچل ہو گئی اور رفتہ رفتہ رہبانیت کے عناصر ایک ایک کر کے ہمزہ دین بن گئے۔ ان نفر فریب گچی پردوں میں ملبوس، اسلام، حیب و زلف خیرت آگے بڑھا تو آریہ ورت کی وہانت نے بوسے تباہ سے اس کے منہ پر سینہ کمانتہ لگا دیا اور اس کے چروں میں اپنی شہرہ و عہد عقیدت کے بچوں چڑھائے۔ اب یہاں ناتوس واذان میں ہم آہنگی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ سچ کے دانے رشتہ زنا میں پھرتے جانے لگے۔ زمرہ گنگلے کے امتزاج سے ایک جدید پسہ حیات کی تلاش ہونے لگی۔ خاک تہاژ اور تہنا جل کے سالہ سے، خدا کے ایک نئے گھر، کی تعمیر سطح خیال سے ابھرنے لگی، ہندی رسومات شعا لہ دین بن گئیں، برہمن کا فلسفہ حیات مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اور رفتہ رفتہ دین تہاژ ہی کا یہ ہیاک بیڑہ، گنگلے کے دھلے سے ڈوب گیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر یورپ سے انکا دامادہ برستی کا بکھر سواج، اپنی شور انگیزیوں اور

تہذیب مغرب

طوفان تہذیبوں کے ساتھ منڈوتا ہوا آیا جس میں کہیں علامتہ انکار دوسرے سنی کی اُفت بردہ ان طغیانیاں تھیں اور کاپی عقل پرستی اور تہذیب ہندی کی بظاہر نکت و عصامت، لیکن درحقیقت بھیاک اور تہذیب گداریاں، جو خدا، رسول، وحی، آخرت، غرضیکہ ایمان و یقین کی ہر مشاع عرب کو خض و خاشاک کی طرح

اپنے ساتھ بہلے لئے جا رہی تھیں۔ بہنِ نظرت میں تو یہ صلاحیت تھی کہ وہ ایسے طوفانِ بلبستے بھی زیادہ پیہب
 دبیحِ طلیانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن جن ریت کی دیواروں نے دینِ حسین کے حصارِ حکم ہونے کا دعو کاوسے رکھا تھا
 ان میں یہ قوت کہاں تھی کہ وہ اس بلاِ انجیزی کی روک تھام کر سکتیں۔ نتیجہ یہ کہ نوجوان طبقہ دین سے بچا نہ ہی نہیں مستغفر ہو گیا۔
 یہ طوفانِ بڑا خطرناک تھا۔ لیکن حاسیان مذہب نے باعوم اس بڑھتے ہوئے فتنہ کا سدھ کھینے کے لئے فتاویٰ تکفیر و تفسیق کو کا ق
 سھا اور یوں اپنی خود فرمی اور عملاً اعترافِ شکست کا ثبوت ہم پہنچایا۔

مذہب پرست طبقہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی ماضی پرستی ہے جو انہیں اپنے تقورات کے تنگ
ماضی پرستی اندازہ سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتی۔ ماضی سے وابستگی ایک گراں مایہ جوہر ہے۔ ہم اپنے اسلام کے
 کارناموں کے وارث ہیں اس لئے اس شارعِ حیات سے مستفید ہونا ہمارے لئے قابلِ فخر ہے۔ لیکن ماضی پرستی اس سے
 الگ چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا اس سے زیادہ اب سمجھا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ پہلے کہا گیا اس پر
 ایک حرف کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس ماضی پرستی کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم جیسی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کو ایک
 خاص ماحول کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم خدا کا آخری پیغام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب
 نظیرِ قیامت تک کے لئے دلے انسانوں کے لئے مضابطہ حیات اور نصابِ زندگی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی
 سے متعلق آئے دن نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان مسائل کا حل بھی قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ ان مسائل
 کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کسی خاص ماحول سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ اگر قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ میں مقید
 کر دیا جائے تو عصر حاضر یا اس کے بعد کے آنے والے انسان اپنے مسائل حیات کا حل اس سے کیسے دریافت کر سکتے
 ہیں؟ اس نظریہ کے تحت قرآن کریم میں تفکر و تدبر کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اور ذہن انسانی رفتہ رفتہ موجود
 قفل اور کو رازِ تقلید و ماضی پرستی کی برزخانی سلوں سے مفلوج اور شل ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم جس طرح کسی خاص قوم یا جماعت کی ہدایت کے لئے نہیں بلکہ نسلِ انسانی ہدایت
قرآنی ہدایت وطنی، تباہی، غرضیکہ تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے انسانوں کے لئے یکساں
 مور پر آئینِ حیات ہے۔ اسی طرح یہ حقیقتِ نظرتِ زمانی تہود سے بچنا آشناسے۔ یعنی جس طرح نظرت کی کوئی شے ہی نہیں
 جو کسی زمانہ میں بجا رہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کہی نہیں کہے گا کہ بس آپ میں تنگ
 گیا ہوں۔ اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو۔ قرآن کریم کی آیات کو ہر زمانہ کے مسائل حیات کے حل کے لئے کھولتے چلیے جہاں
 اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ۔ ان کے پیچ و خم میں پٹاٹے گا۔ نظرت کی کسی چیز کو بھٹے۔ مثلاً پانی کے تعلق ابتدائی زمانہ کا انسان
 اٹا ہی جاتا تھا کہ اس سے پانی بھائی جا سکتی ہے۔ لیکن پانی کے اندر بھی جوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم۔ تجربہ و شہد
 کے ساتھ ساتھ ہوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لٹی ہوئی تھیں۔ آج پانی سے جس قدر کام لے جاتے ہیں
 ابتدائی زمانہ میں بھی یہ خصوصیتیں اس کے اندر موجود تھیں۔ اور آج بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پانی تنگ اندر میں قدرتیں غائب
 ہیں سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں۔ اسی نفا کو دیکھئے جو کل تک خالی کھجائی تھی۔ آج اس میں ایسے حرکت لہروں نے ایک نئی دنیا

آباد کر دی ہے۔ ایتھر کی امرات تو پہلے بھی موجود تھیں۔ اسی خلا میں آسودہ اس انتظار میں تھیں کہ انسانی علم و دانش کی سطح بند ہوتے ہوتے انہیں چھوئے اور وہ اپنی چھٹی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ قرآن کریم بھی کتابِ فطرت ہے۔ اس کا بھی یہی عالم ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جن بلند یوں تک پہنچا ہے اذنا پلا بلئے۔ یہ ہر مقام اور ہر طبقہ پر انسانی رشد و ہدایت کا سامان ایشہ اندر رکھتا ہے کہ یہ اس مذکورہ فطرت سے پیغامِ ہدایت ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور صیغہ کے علم سے کوئی شے باہر نہیں۔ اسے خوب معلوم ہے کہ اللہ کی فطرت کیلئے ہے اور اس کے تعیناً کیا گیا ہے انسانی زندگی کے سامنے کیا کیا مشکلات ہیں آئیں گی اور ان کا فطری حل کیا ہو گا۔ اس لئے قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قیامت تک کے لئے نوحِ انسانی کا لغابِ زندگی ہے۔ لہذا ہمارے تہجد پسند مزہب زدہ طبقہ کا یہ خیال کہ یہ چودہ سو برس کے پڑانے فطریاتِ حیات اس علم و عقل کے زمانہ میں کس طرح منابطہ زندگی بن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی حقیقت سے تجفیری پر مبنی ہیں۔ قرآن کریم نہ چودہ سو سال کا پرانا ہے اور نہ صرف اسی زمانہ کے لئے تھا۔ یہ ہر وقت نیا ہے۔ ہر زمانہ کی چشمِ دانش دیکھ بصیرت کے لئے روشنی ہے اور قیامت تک کے لئے اس میں تذبذب و تفلک کے درد اور سے کھلے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں تدریج کے یہ نسخہ نہیں کہ انسان اسے اپنے ذہن کے تابع کرے۔ یعنی پہلے اپنے ذہن میں کچھ خیالات واضح کرے۔ پھر قرآن کریم کو ان کے قالب میں ڈھاننا شروع کرے۔ یہ تو کھلا ہوا الحاد ہے۔ قرآن کریم کے حقائق حکم اور اہل ہیں۔ وہ انسانی امیال و موافقت اور رعبانات و جذبات کے تابع نہیں ہو سکتے۔ مومن وہ ہے جو اپنے تمام رجحانات قلبی و ذہنی کو خدا کی اس کتاب مقدس کے تابع رکھے۔

قرآن و فہمی اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا جاسکتا اور کوئی شخص اسے اپنے تابع بھی نہیں رکھ سکتا تو پھر اسے سمجھائیے جاسکتا ہے؟ قرآن کریم کی رو سے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں وہ کسی خارجی تفسیر کا محتاج نہیں وہ علمِ خداوندی کا نورِ مبین ہے۔ اور نور کو کسی انسانی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس ذلنے سے نازل کیا ہے اس نے اس کی تفسیر بھی خود اپنے ذمے لے لی ہے۔ ﴿قُرْآنٌ عَلَیْنَا بَیِّنَاتٌ ۝۱۰﴾ قرآن کی تفسیر ہمارے ذمے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خالقِ فطرت نے کلی کو پیدا کیا ہے وہی اسے کھلا کر بھول بنا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ کلی کو مٹا کر بھول بنا دیں تو نہیں بنا سکیں گی اس کی پتیاں بھر جائیں گی بھول نہیں بنیں گی کہ جس مرتبہ منجھنے کی شگفتگی خود خالقِ فطرت کا کام ہے، قرآن کی تفسیریں و تفسیریں اللہ ہی کے ذمے ہے۔ اس کی ہدایت خود اس کی مدد سے سمجھیں آسکتی ہے۔ اب اس کے سمجھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

قرآن کریم کے معنائیں جس انداز و طریق سے بیان کئے گئے ہیں اور ان کی ترقیب میں جو حسنِ اسلوب اور نظم و دربط ہے۔ اس سے متبرکہ کہا۔ اس جیسا اسلوب و انداز انسان کے عیضہ امکان میں نہیں۔ لیکن قرآن کا انداز ترتیب و بیان انسانی تصنیفات سے الگ ہے۔ وہ ایک معنوں کو مسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ ایک جگہ ایک حکم مذکور ہے۔ دوسری جگہ اس پر اضافہ ہے۔ کہیں استثناء ہے کہیں اجمال ہے کہیں اس کی تفصیل ہے۔ اس انداز بیان کا نام

قرآن کریم کی اصطلاح میں ۱۰۰ تشریحات آیات ۱۰ یعنی آیات کا پھر پھر کر لانا ہے، اور اس سے فرض قرآن کی تفسیر کرنا سمجھانا ہے۔ اَنْظُرْ كَيْفَ تُصَوِّرُ الْاٰيَاتِ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۰) (پہلے) دیکھو ہم کس طرح آیات کو پھر پھر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم تشریحات آیات اس لئے کرتے ہیں لِتَذَكَّرُوْا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۰) (پہلے) تاکہ سمجھنے والوں کے لئے ہم اسے (قرآن کو) واضح کر دیں۔ غور فرمائیے۔ اور سورۃ قیامہ کی آیت (۱۱۴) میں ارشاد تھا کہ اِنَّ عَلَيْنَا اٰيَاتِنَا (قرآن کی) تبیین بیان تمہارے ذمہ ہے۔ اور یہاں (سورۃ النعام) میں فرمادیا کہ یہ تبیین (التبیین) تشریحات آیات سے کی جاتی ہے۔ سو قرآن کریم نے خود ہی فرمادیا کہ تشریحات آیات سے قرآن اپنی تفسیر آپ کو دیتا ہے۔ اس کی تفصیل مہارت القرآن کی کسی آئینہ جلد میں قرآن کے عنوان کے ماتحت ملے گی۔ اس حقیقت کے پیش نظر قرآن کریم کے مطالب کو سمجھنے کے لئے یہ فردی ہے کہ مسئلہ زیر نظر سے متعلق تمام مباحث، مقامات و آیات متعلقاً بیک وقت لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس کے لئے قرآن کریم پر بڑے بڑے عبور کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں بالعموم ہماری جو حالت ہے وہ ظاہر ہے۔ نوجوان طبقہ میں قرآن کریم کی طرف جھنجھو بہت رحمان پیدا ہو رہا ہے اور غیبت ہے۔ ان میں ایک ایسی پیاس کے آثار نظر آ رہے ہیں جسے وہ کتاب حکیم کے حشو حیات سے سیراب کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے یہ قوت رکھنا کہ وہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے اس پر ایسا عبور حاصل کر لیں گے جس کا ادب کیا جا چکا ہے اور وہ جو مہم ہے۔

یہ وہ وقت تھی جو ایک عرصہ سے میرے سامنے آرہی تھی سعادت مند نوجوانوں کے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہونا۔ وہ مجھ سے پہچنے کہ ہر قرآن کو کس طرح سمجھیں۔ اس کا جواب بھی ہو سکتا تھا کہ قرآن کو پڑھو۔ پڑھنے ہی سے سمجھیں آئے گا۔ لیکن جب وہ کہتے کہ ہم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے لیکن نہ صوفت یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کے اندر میں کوئی لذت و جاہلیت محسوس نہیں ہوتی تو اس سوال کے جواب میں ایک حضرات آئینہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس لئے کہ مستفسرین کے صحیح ذوق بھی تڑپ اور جذبہ صداقت میں میرے لئے مستحب کی کوئی نگہداشت تھی۔ میں نے اس مشکل کو صحیح درجہ اور اس کا حل معلوم کرنے میں غور کیا۔ اور ہر بار اسی تیج پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ مختلف مباحث و مسائل بیک نظر ان کے سامنے آجائیں۔ اور اس لئے فردی ہے کہ ان کے سامنے قرآن کریم اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو، یعنی جو بات قرآن کریم پر ازاد عبور حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتی چاہیے وہ انہیں خود تیار کر کے دیدی جائے۔ اور پھر مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کی تمام دکھاوے کو اس طرح یک جا پیش کیا جائے کہ وہ ایک مربوط و سلسلہ مضمون کی صورت اختیار کرے۔ یہ چیز ہماری مردہ تفاسیر میں نہیں مل سکتی اس لئے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہیں۔ جس سے آیات کا مطلب سمجھ میں آجائے تو آجائے لیکن قرآن کریم کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تبویب القرآن پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان میں بالعموم آیات کو الفاظ کے اعتبار سے بجا کیا گیا ہے۔ موصوع کے لحاظ سے نہیں۔ اگر کہیں موصوع کا بھی خیال رکھا گیا ہے تو آیات کو لیکر مروجہ مضمون کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

ان حالات میں قرآن کریم کی تعلیم کو مذکورہ صدر نئیج پر مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ایسے کام درحقیقت جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ دور انفرادیت میں جبکہ جماعتی نظام کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ یہ امید کہ کوئی جماعت اس مقصد کے لئے تیار ہو جائے گی موہم تھی۔ میں نے کوشش بھی کی کہ کوئی جماعت اس کے لئے آمادہ عمل ہو جائے لیکن ناکام رہا۔ اب میرے لئے سوائے اس کے چارہ کار نہ تھا کہ میں اس عظیم اٹان کام کیلئے خود ہی قدم اٹھاؤں۔ چنانچہ جو نعتیہ میرے سامنے تھا اس کے مطابق میں نے بحرِ شہ در تین عزمانت کو لیا۔ ایذا میں کچھ وقت غور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ایک طرف اہل طلب کا تقاضا، دوسری طرف اس نحو ہی کی کوشش کے دورِ شندہ نتائج، اب میرا خیال یقین کی حد تک پیش گیا کہ یہ کام کرنے کا ہے۔ کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں جو مسلحانہ تھیں، لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی ہیبت بڑا اثری، بالآخر نائیجی نے مجھے اس صبر آزا مادِ عظیم المرتبت ہمہ کے لئے آمادہ کر دیا۔ اور اس کے بعد میں نے اس فریضہ مقدس کو مقصد مذکورہ سے نرا اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس جنون کی نذر کر دیا۔ چنانچہ بارہ برس ہونے کو یہ یہ مرحلہ شوق سلسلے سے ہو رہا ہے۔ سینکڑوں ابواب تجویز کئے گئے۔ ہر باب کے ماتحت سینکڑوں عزمانت قائم ہوئے۔ ہر عزمانت سے متعلق سینکڑوں آیات قرآنی کی بحثیں، یہ کام ہو چکا تو اس منزل کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔ اور ہر عزمانت کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک خاص ربط معنوی قائم کر کے انہیں سلسلے اور مرتبہ مضامین کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔ اس سے قرآن کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف دانسا ٹیکلو پیڈیا مرتب ہو گیا جو سماں حقائق قرآن سے متعلق تمام دکان تعلیم، ایک ایک عزمانت کے ماتحت ایک ایسے سلسلے اور ولی کن معنوں کی صورت میں سامنے آجاتی ہے جس میں قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طویل القاعدہ عمارت کا پورا سالہ تیار ہے اور اس کا ایک گوشہ یا یوں کہئے کہ منزل اولین تعمیر ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ میں اس مرحلہ شوق و جنون کی قطع شدہ منزل پر جب نگہ باز گشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یا اللہ! یہ مسافت میں نے کس کس طرح کی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو شاید کئی عمروں میں بھی مجھ سے اتنا کام نہ ہو سکتا۔ **وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَآءُ** اس مقام پر جہاں میری جبین نیاز بارگاہ بزدی میں اظہار شکر و امتنان کے لئے زمین ہوس ہے۔ وہاں میرے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں وہ ہستیوں کے لئے جذبات سبب گذار ہی رہتیاں ہیں ایک حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جن کی نگہ حقیقت میں دبصیرت افزا، اس وادائی شوق میں میرے لئے حجازِ فراہ بنی۔ اور دوسرے سفینِ محرم علامہ محمد اسلم حیراج پوری مدظلہ العالی جن کی رفاقت و شفقت سعوبات سفر میں حوصلہ بخش و جنت افزا ہوئی! اللہ تعالیٰ اذل الذکر کو اپنے حجازِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ثانی الذکر کو خدمت قرآن کریم کے لئے تازہ سلامت رکھے۔

یارب! میں آرزوئے من چر خوش است

میں ایک مرتبہ اس حقیقت کو بھرا دینا چاہتا ہوں کہ مسافت القرآن یا اس پنج کی کوئی اور کتنا جان کریم

کابل نہیں ہو سکتی۔ قرآن اپنے الفاظ، آیات بلکہ سورتوں تک کی ترتیب میں قرآن ہے کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی ترتیب میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔ اس لئے معنائین کے اعتبار سے آیات قرآنی کی ترتیب تدوین کے بچنے میں ہولت پیدا کرنے کے لئے ہے۔ جس طرح ترتیب قرآن، قرآن سمجھنے کے لئے مفید ہوتا ہے۔ نہ ترتیب میں کتاب کابل ہو سکتا ہے۔ نہ آیات کی معنائین کے اعتبار سے ترتیب۔ ترتیب قرآن کابل ہو سکتی ہے۔ یہ بعض قرآن کریم کے بچنے اور سمجھنے کے مختلف اسباب ہیں۔

قرآن کریم ضابطہ سماعت ہے، تاریخ اور جغرافیہ فلسفہ اور ہیئت طبیعی اور حیاتیات، انگلیات اور حقائق الارض کی کتاب نہیں۔ لیکن چونکہ

تفسیر قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں

یہ اس کی کتاب ہے جس کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں نمٹا اور طبعا جہاں جہاں متفرق علوم و فنون کا ذکر آ گیا ہے ان اجمالی اشارات میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر آئی ہیں۔ مثلاً وجود باری تعالیٰ یا حیات اخروی کے دلائل میں تخلیق ارض و سموات کا ذکر آ گیا ہے تو ہر چند یہ ذکر ایک نئی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ہر نہیں سکتا کہ سائنس کے انکشافات تخلیق ارض و سما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہو جو قرآن کریم میں مضموناً مذکور ہے۔ اگر ان دونوں میں اختلاف ہے تو سمجھ لیجئے کہ مہز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچتی تھی اور تیس کی حدود کے اندر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم جو اولاً اور اصولاً حیات انسانی کی ہدایت کا ضابطہ ہے، مختلف علوم و فنون کا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔ لہذا قرآن کریم کے ان گوشوں کی تفسیر و مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں کسی ایک شخص کا کام نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی رو سے ان مقامات کے سائنسی توضیحیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان سائنسی تفصیلات و جزئیات وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان علوم کے ماہر ہوں اور جیسا کہ ذہن انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن میں کہاں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اور قرآن کریم اس سے بھی آگے کہاں تک لیجاتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں ہر ایک شعبہ کے لئے الگ الگ ماہرین کی ضرورت ہے جو قرآن کی روشنی میں ان علوم کی سرچ و تحقیق، اور اس کے نتائج سے قرآن کریم کے اجمالی اشارات کی تشریح کریں بعض اہل ذوق حضرات نے اس قسم کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن یہ کام انفرادی کوششوں کا نہیں، حکومت یا نظام جمہوری کا کام ہے۔ ماہرین فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لیکر اس پر عرصہ صرفت کریں اور اپنی تحقیقات کے نتائج کے منتقل کوئی عملی حاشیہ۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی متشابہ آیات، حکمت کی ذمہ داری آتی جائیں اور انسان علی وجہ البصیرت پکارے کہ ذلک الکتاب لاس یب فیہ۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات کی تشریح میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ان مقامات پر ایسا زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکا ہوں کہ ان خاص علوم کے اصول و سببیتا قرآنی روشنی میں بیان کروں تاکہ اس سے ذہن میں ایک اجمالی سا تصور مرتب ہو جائے کہ قرآن کریم اس خاص فن میں کیا اصول بیان کرتا ہے۔ یہ مقامات فنی امور سے متعلق ہیں لیکن قرآن کریم کا وہ حصہ جو نفس انسانی کی ہدایت و تعلق ہے اور جو انفرادی اور اجمالی زندگی کا دستور اسامی ہے اس کا واضح تفسیر و تشریح کے سائے چاہئے گی۔

میں نے اس چیز کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ آج کل ہمارے مزید ذہن نوجوان طبقہ کے دلوں میں جبرائیل کے شکوک و شبہات ماسطور پر پیدا ہوتے ہیں ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہو جائے۔ اس ضمن کے لئے مجھے تمہیدی اور توضیحی عبارات بڑھانی پڑی ہیں۔ لیکن عہود ان کا بھی قرآن کریم ہی کی تعلیم ہے۔

ترتیب کتاب | انسائیکلو پیڈیا دائرۃ المعارف کی ترتیب بالعموم حروف تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے لیکن میں نے معارف القرآن میں اس ترتیب کی بجائے اس ترتیب کو ترجیح دی ہے، جو قرآنی تعلیم کی خصوصیت ہے۔ قرآن کریم تمام عقائد و اعمال - یعنی نظریات زندگی اور ان کی عملی تشکیل ایمان بائبل کی حکم بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اس ایمان و عمل کی تفصیل کے لئے پیغام رشد و ہدایت حضرات انبیاء کرام کی رسالت سے آگے تک پہنچتے رہے۔ ان پینتات کی مدد میں انسانی زندگی کی رانفرادی و اجتماعی تشکیل ہوتی رہی۔ اب ان کا آخری اور مکمل مجموعہ قرآن کریم ہے۔ جو انسان کو اس کی نظرت کے مطابق زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی کوششیں صحیح نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ اس تمام سہی و عمل کے بعد ایک دوسری زندگی شروع ہوتی ہے جسے حیات اخروی کہا جاتا ہے۔ یہ ہے ایک سرسری سا خاکہ قرآنی تعلیم کی ترتیب کا۔ معارف القرآن میں بھی اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور مختلف مہلکات کے عنوانات بھی دیئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) اللہ ایمان بانند کا مفہوم - صفات باری تعالیٰ کی تفصیل - اس ایمان کا حیات انسانی پر اثر۔
(۲) رسالت (مصلحت) - وحی کی حقیقت - حاملین پیغامت خداوندی و علیہم السلام کا تذکرہ جمیل حضور

کی بیشتر مقدمہ کا مفہوم

(۳) کتب پیغامت خداوندی کے قرآنی تذکرے - اس سلسلہ و راز کی ابتدا و انتہا۔

(۴) کائنات انسان اور اس سے متعلقات کی تفصیلی بحث

(۵) آخرت حیات اخروی - مکانات عمل - جنت و جہنم

کائنات کے عنوان میں ہم گہرا اسلامی نظام - قرآنی تعلیم - دنیا کے مختلف نظریات زندگی - اطلاقی معاشرتی - سماجی - تمدنی - عمرانی - اقتصادی - نفسیاتی - اجتماعی - مباحث - مختلف علوم و فنون - مثل تاریخ و جغرافیہ - اخروی تحقیقات -

سہ ابتدا ہی خیال تھا کہ دوسری جلد میں رسالت اور تیسری میں کتاب کے عنوانات مکمل ہو جائیں گے۔ لیکن اصل ترتیب کے تحت دیکھا گیا کہ جلد دوم میں رسالت سے تعلق صرف اصولی بحث ہو سکی ہے اور اس کی تفصیل جلد دوم کے مقدمہ میں ملے گی؛ اور تیسری جلد میں حضرات انبیاء کرام کی تاریخ ہے۔ اس لئے رسالت اور کتاب کے دونوں عنوانوں کو یک جا کر دیا گیا۔ اب یہ عنوان جلد چہارم میں سیرۃ طیبہ حضور فتم المرسلین کے ساتھ تکمیل پذیر ہو گا۔ اور سلسلہ پنجم میں کائنات کا عنوان

کئے گا۔ ان اشارت

اس کے بعد کتاب کی ترتیب کے متعلق کچھ تفصیل میں جو کتاب کے مطالعہ کے وقت ہی کا آمد

ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں سے حذف کر دیا گیا ہے۔

طہارۃ اسلام

یہاں کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میری کوشش ناقص یہ ہے کہ قرآن کے سہاوت و مقاصد عالیہ کو

اعتراف

اس آغاز میں پیش کر دوں کہ ہر مسئلہ اور ہر مقصد سے متعلق قرآن کریم کے تمام گوشے بیک نظر آپ کے

ساتھ آجائیں۔ اور میں نے امکان بھر بعد و جہد کی ہے کہ کوئی باب تشنہ تکمیل نہ رہ جائے اور اس میں کوئی شے غیر قرآنی

دائے پلنے۔ لیکن بایں ہمد امتیاط و کوشش۔ بہ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انسانی دماغ کا دانش کا نتیجہ ہے۔ جو کسی صورت

میں بھی یہ وہ دخل سے منزہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک عرصہ سے مختلف مباحث پر کچھ نہ کچھ لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن یقین پلنے

کہ قرآن کریم کے متعلق ایک لفظ لکھتے وقت بھی میری روح کا ناپ اٹھتی ہے۔ ہاتھ تھر تھرا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بہت بڑی

اور یہ مرحلہ نہایت نازک ہے۔ انسان جوں جوں قرآن کے قریب ہوتا ہے اس کی عظمت اور اپنی کوتاہیاں نمایاں ہوتی

چلی جاتی ہیں۔ اس سے مجھے یہ دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ بھجا گیا ہے وہ لفظ آخر ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے

ترمیم و اصلاح کی گنجائش نہیں۔ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہے کہ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم استیعاباً معارف القرآن

کے اندر آئی ہے۔ اتنی کوشش اور محنت کے باوجود سینکڑوں عنوانات ایسے ہو سکتے ہیں جن کا اس پر امتداد کیا جا سکتا

ہے۔ قرآن کریم تو ایک ایسا بحر ہے کہ اس کے کوئی انسانی مثل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ فقط ایک

فائدہ ہے اس حقیقت کے سمجھنے کے کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم یوں سمجھیں آ سکتی ہے۔ دنیا آگے بڑھے گی اور اس خاک میں نہ

بھرے گی۔ زمانہ ترقی کرے گا اور ان بنیادوں پر نلک بوس عمارت تعمیر کرنے لگا۔ میرا شمار تو اتنا ہی ہے کہ وہ سیدہ میں

جو قرآنی حقائق کی ٹرپ رکھتی ہیں ان کے لئے اہدائی مشکلات حل کر دوں جو قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے میں ان کے

راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ میرے پیش نظر قرآن سے تعارف کرانا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم میں وہ خود کوشش و جازمیت

ہے کہ انسان اسے کسی قیمت پر بھی چھو نہیں سکتا۔ میں کیا عرض کر دوں کہ قرآن میں کیا نکتہ ہے۔

ذوق اپن بادہ نہانی بخند انا پانچشی

دنیا کا کوئی اور سردار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مقابلہ تو ایک طرف سمجھنے کے لئے ٹھیک ٹھیک تشبیہ نہیں دیکھا سکتی۔

میں طرح شہب کے بعد ہر شہاس پھکی مسلمم ہوتی ہے۔ سورج نکلنے کے بعد ہر چراغ ماند پڑتا ہے۔ قرآن سامنے آجائے

کے بعد ذہن انسانی کا بلند سے بلند شاہکار کھلنا بن کے رہ جاتا ہے۔ جوں جوں اس کے حقائق بے نقاب ہوتے جاتے ہیں

انسان وہ دستر تہ سے عیوم اٹھتا ہے۔ ہر شے کی صحیح قدر قیمت سامنے آجاتی ہے۔ اس کی نگاہ کا ناز یہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔

چوں بجاں و درفت جباں دیگر شود

جاں چو دیگر سفد جباں دیگر شود

میں اپنی اس لذت میں آپ کو بھی مشرک کرنا چاہتا ہوں کہ تکمیل مسرت دوسروں کی شرکت سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر میری یہ حقیر سی کوشش کسی ایک سید روح کے لئے بھی قرآن فہمی کے ذوق کا موجب بن گئی۔ تو میں سمجھوں گا کہ میری کاوشوں کا بھجے کافی مدد مل گیا۔ اصلی مدد تو اس شاہنشاہ ذرہ نواز کی بارگاہِ محمدیت سے ہی مل سکتا ہے۔ جو تیروں کا جنتے والا اور اعلانِ خدا سے واقف ہے۔ جو مساعی اس کے ہاں مشکور ہوں وہی نتیجہ خیز ہیں۔ اور جو دہاں ناپسند ہوں وہ غلام۔ بظاہر کسی ہی درختِ زندانگ کیوں نہ ہوں۔ دنیا و آخرت میں سوجب ہلاکت ہیں۔

معارف القرآن کی تہذیبی اور توسیعی عبارات میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ میرا نہیں قرآن ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں تو ہوا المراد۔ لیکن اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو بلا توفیق اس حصہ کو نظر انداز کر دیجئے اور قرآن کریم کو از نو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس صورت میں یوں سمجھئے کہ میں نے آپ کے لئے قرآن کریم کی آیات کو مضامین کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔ اور بس۔ معنویت کے علاوہ چند الفاظ معارف القرآن کی صورتی حیثیت سے متعلق بھی گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ چونکہ کتاب میرے اپنے ذوق کا پیکر اور زندگی کا مقصود ہے۔ اس لئے ہی میں تمہارا صورتی حیثیت سے اسے نہایت پاکیزہ اور باذہب نظر بنانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اتفاق کہ طبعا دل کی تکمیل اس زمانہ میں ہوئی جبکہ جنگ کی وجہ سے حسن ذوق کی رطبت تو کھا۔ مزیزیات تک کا پورا ہونا مشکل ہو گیا۔ میرے شوق کا تقاضا تھا کہ مساعد حالات کا انتظار کیا جائے۔ لیکن اسباب کے نامی تمنا ایک دن کا توفیق بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے جو کچھ بہترین میسر ہو سکا فراہم کیا گیا۔ حاصل آپ کے سامنے ہے۔ ہی چاہتا تھا کہ اس مقام پر ان اصحاب کا شکریہ ادا کروں جن کی سعی و محنت نے مجھے بہت سی عیب و کاوشوں سے بچایا۔ لیکن جھجک کر رک گیا کہ حمد شتہ قرآنی نسبت سے پورا ہوتا ہے۔ وہ ان تمام رسمیات سے بے نیاز ہے۔

دعا ہے کہ یہ حقیر وہے مایہ سی مشاع عزیزہ جو اس رب العزت کے آستانہ عالیہ پر، بھگی ہوئی نگاہ، ورق آرزو پیشانی لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر حاضر ہو جا ہوں۔ اس کے حضور میں شرفِ بارگاہی کی تقریب بن جائے۔ عجاہ اس کی چشم گرم پر ہے۔ صلہ معارف پر نہیں کہ سنتا ہوں کہ اس کے بازو رحمت میں حادد کے کچھ ایسے ہی انداز ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اٰخْطَاْنَا، سُبْحٰنَكَ لَا تَحْمِلُ عَلَيْنَا اِضْرًا كَمَا تَحْمِلُهُ
عَلَى الدُّنْيَا، رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَالِكًا لِّطَافَةِ لِكَاِبَتِكَ وَاغْفِرْ عَنَّا نَتَّ
وَاَرْحَمْنَا اَنْتَ مَوْجِبُنَا لِنَا نَصْرِنَا عَلَى الْفُجُوْرِ وَالْكَفْرِ نِيَّه

غلام احمد پتویدیز

اسلام کا نظریہ جہاد

(۴)

(حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی، بنگلہ دیش)

اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق و منیت

سوال کی دوسری شق یہ تھی کہ اسلام غیر مسلموں کو کس شرط پر زندہ رہنے کا حق دیتا ہے کہ وہ قبولِ جزیہ کے بعد حکومت و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں، یعنی حکومتِ اسلامی میں حریتِ فکر و آزادی رائے اور حقوقِ منیت صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور غیر مسلم ان بنیادی حقوق انسانی سے یکسر محروم ہوتے ہیں اور از بسکہ جہادِ اسلامی اشرافِ تجسس کے اعتبار سے اقوامِ دنیا کی قومی اور نسلی جنگوں سے مختلف نہیں ہے کیونکہ ان اقوام کی جنگوں کا حاصل بھی یہی کچھ ہے کہ کسی ملک پر قابض ہونے کے بعد حکومت کے نظم و نسق اور ملک کی پیداواری قوتوں کے مالک و متصرف بن جائیں اور وہاں کے اہل باشندوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی آزادی سے محروم کر دیں یہاں تک کہ وہ اپنے قدیم آبائی وطن میں محض مسافر اور غریب الدار انسانوں کی طرح مجبوری و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

اس مسئلہ کی دو حیثیتیں ہیں: ایک نظری اور دوسری عملی، اول الذکر حیثیت کتاب و سنت سے معلوم کی جاسکتی ہے اور دوسری کتبِ تاریخ و سیر سے! مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اس کی دونوں حیثیتوں کو زیرِ بحث لایا جائے۔

گذشتہ بحث میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلام کے احکام صلح و جنگ اور قوانینِ دینی کا پس منظر ایک دینِ ترانسانی برادری اور مہرگیر امن و مساوات کے قیام کا پرخلوص حزم ہے چنانچہ اسلام کے مجموعہ قوانین جنگ اور دینِ اہلِ آئین کو اگر نظرِ فائر سے دیکھا جائے تو ان میں، احرامِ انسانیت، اعلیٰ اخلاق اور بلند رت سیرت و کردار کی مقدس روح کا رفرنا نظر آتی ہے، اور اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ انسانوں سے ایسا سلوک کریں جو اخلاقی نقطہ نظر سے میوہِ بویا میں سے اس و صلح کے مقصدِ عظیم کو شمس گشتی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن کے اخلاق سونا و زرِ خلافتِ انسانیت اعمال کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہی حکم دیا ہے کہ وہ قومی تعصب یا جذباتِ انتقام کے ماتحت ہرگز اسلامی ضابطہ اخلاق اور مہرگیر اصولِ انسانیت کی خلافتِ دینی نہ کریں اور وہ اس کی پرواہ نہ کریں کہ دشمن اس طرح کے

مذہبی اخلاق و انسانیت اعمال کا ارتکاب کر رہا ہے بلکہ مسلمانوں کو ہر حال میں عدل اختیار کرنی چاہئے۔
 یا ایہا الذین آمنوا کوٹوا قوامین اللہ شہدا اذ بالقسط ولا یجھمنکم نشان قوم علی
 ان لا تعدوا اعداؤہم اقرب للتعوی واقفوا ان اللہ خیر بما تعملون۔ (المائدہ)
 اے ایمان والو! تم اللہ کے لئے حق و انصاف کے گواہ بن کر پوری قوت سے کھڑے ہو جاؤ اور تم کو
 کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم کسی سے نا انصافی کرو، تم عدل کی راہ اختیار کرو کہ یہی
 راہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

غزوہ احد میں قریش نے مسلمانوں کے سردار محمدؐ کے اور حضرت حمزہؓ کا شہد کیا تو اس سے قدرتی طور پر آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا اور کچھ مسلمانوں نے عزم کر لیا کہ جب ہم ان پر غالب آئیں گے تو ان کے دو چند
 آدمی قتل کریں گے اور ان سے ایسا ہی سلوک کریں گے جیسا انہوں نے کیا ہے۔ مگر خدائے قدوس نے اس
 بات کو ناپسند فرمایا کہ مستی اسلامی (جس کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و نا انصافی کو ختم کرے اور
 عالم انسانی کو عدل و راستبازی کی راہ دکھائے) کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس سے اسکی اخلاقی عظمت
 کو ضیاع لگتی ہو چنانچہ مسلمانوں کو اس عزم سے باز رکھنے کیلئے قرآن کی آیت نازل ہوئی۔

وان عاقبتکم فعاقبوا بمثل ما عوقبتکم بہ ولئن صبرتم فہو خیر للصابرین (المصل)
 اگر تم جبرہ لینا چاہتے ہو تو ان کو اتنی ہی اذیت دو جتنی تمہیں دی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو
 اہل صبر کے لئے یہ بہت اچھی بات ہے۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بل نصبر ہم صبری کریں گے۔

یہ منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک ان کی نہ پروردار سخت گیر انسانوں سے کیا جا رہا ہے جو اس وقت کرہ ارضی
 میں سب سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے مگر قرآن حکیم غیر مسلموں کے غیر محارب افراد و قبائل سے اور
 بھی زیادہ مروت و احسان کی اجازت دیتا ہے۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولہو یخیر جو کھ من دیا رکھ ان سے روہم
 وقتہ طوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین (المتنہ) اللہ تعالیٰ انہم کو ان کا غار و مشرکین کے
 ساتھ مروت و احسان کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑتے نہیں ہیں اور انہوں
 نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف پسند لوگوں کو دوست
 رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام کسی انسان کو محض اختلاف عقیدہ و مسلک
 کی بنا پر انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کرتا بلکہ وہ ہر حال میں قیام بالقسط، اختیار عدل اور
 احترام اخوت بشری کا حکم دیتا ہے بلکہ ہر ممکن صورت میں اہل کفر سے بہترین سلوک اور مروت و احسان کی

تلقین کرتا ہے۔ ہاں اے صحیح ہے کہ اسلام ان لوگوں کو کسی طرح کی رعایت نہیں دیتا جو خدا کی زمین کو فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنانا چاہتے ہوں اور مخلوق خدا کو بے وجہ نشانہ تم بنا رہے ہوں۔ کیونکہ اسلام اپنے سامنے ایک بلند تر مقصد رکھتا ہے جس کی تکمیل کے لئے بہر حال ایسے شرعی عناصر کا استعمال ناگزیر ہے اور صرف اسی غرض کے لئے جہاد باسیف کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔

انسانی حریت و مساوات کا غیر مبہم اعلان | عالم انسانی آج تک حریت و مساوات کے چشمہ

جیواں کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے بارے میں ابھی آج تک اس کے لب تشنہ کو نصیب نہیں ہو سکی اور جس قدر انسان کی تشنہ لمبی بڑھ رہی ہے اور اس کے ذوق طلب میں شدت پیدا ہو رہی ہے اسی قدر اس کی منزل مقصود اسکی نگاہوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مگر حریت ہے کہ صدیوں سے کھانے کے بعد بھی اس کا قدم اسی غلط راہ پر گامزن ہے۔ اے کاش! دور حاضر کے انسان کو یہ کون بتائے کہ یہ پُرخطر اور کٹھن منزل علم فلاطون سے نہیں بلکہ وردول ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

بر عقل فلک پیا تر کا نہ شبیخوں بہ | یک ذرہ درود ل از علم فلاطون بہ

اگر فی الواقع انسان کو حریت و آزادی اور امن و مساوات کی خواہش ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ پہلے نظریات انسانی کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر خدائی فلسفہ زندگی کو اپنا رہنما بنائے اور اگر وہ ایک طرف حریت و آزادی کا فروہ بلند کرتا رہے اور دوسری طرف اس کا اپنا ذہن و فکر انسانوں کے بنائے ہوئے فلسفہ ہائے زندگی کی زنجیروں میں مقید رہے تو اس کی خواہش کی تکمیل دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

آج عالم انسانی جن شدائد و خطرات میں گھرا ہوا ہے ان کا اہل سرچشمہ رنگ و نسل کا امتیاز اور وطنی عصبیت ہے، مگر کتاب اشعنے چند لفظوں میں اس عقیدہ کو حل کر دیا ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوبا و قبائل لتعاسروا

ان اکرمکم عند اللہ التقا کم۔ (آیہ)

اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر شعوب و قبائل میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے سے (میزانم کے ذریعے) پہچانے جا سکو۔

بیشک تم میں معزز تر اور بزرگ تر وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترین اور باعمل ہے۔

شعبہ سلسلہ نسب کی ابتدائی گڑھی ہے جو بعد میں آنے والی گڑھیوں کے لئے سبب کی حیثیت رکھتی ہے اور بعد میں آنے والی گڑھیوں کو قبائل سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے قرآن حکیم کا منشا یہ ہے کہ سلسلہ نسب ابتداء سے انتہا تک نفس انسانی پر اثر انداز نہیں ہوتا اور ہر انسان بحیثیت انسان کے بنیادی حقوق انسانی کا تحفظ ہر حادثہ نبوی میں اس مسئلہ کو اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاد اللہ کے سلسلہ میں سرور دو جہاں صلعم نے اور بیت سے اہم اجتماعی مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر کبھی بالفاظ ذیل تفسیر فرمایا۔

ایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم بنو ادم و ادم من تراب
 اگر تم کو اللہ عند اللہ اتقا تم واپس عربی علی عجمی فضل الالہا التقوی (جمہور الخلیفہ)
 سے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم علیہ السلام
 کوٹی سے پیدا کیا گیا بیشک اللہ کے نزدیک معزز تر وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ صالح اور
 نیک ہے اور کسی عربی کو عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی دوسری وجہ فضیلت نہیں ہے۔

ان نصوص کتاب و سنت سے ظاہر ہے کہ اسلام میں ہر انسان بغض انسانیت کی بنا پر ہر قسم کے عمرانی ،
 تہذیبی اور سماجی حقوق کا مستحق ہے اور کوئی خارجی امتیاز اس کو ان حقوق سے محروم نہیں کرتا۔ سوائے اس ایک
 صورت کے جس کا طور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ انسان خود ہی فساد اور فسق و معصیت سے اپنے آپ کو اس
 حق سے محروم کر دے۔

حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا کے حقوق | یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انسانیت عامہ سے
 متعلق ہے۔ مگر ان غیر مسلموں کی حیثیت اس سے
 مختلف ہے جو حکومت اسلامی میں باقاعدہ رعیت کے طور پر رہتے ہیں، یعنی ان لوگوں کے جان و مال کا تحفظ
 اور ان کے حقوق مذہبیت کا احترام حکومت اسلامی کے لئے اخلاقی حیثیت کے علاوہ قانونی اور آئینی
 (لیگل) لحاظ سے بھی ضروری ہے۔ یہ اسلامی پالیٹکس کا ایک مستقل باب ہے جس پر کچھ تفصیلی تبصرہ کی ضرورت
 ہے۔ اور اس وقت یہی مسئلہ ہمارا موضوع بحث ہے۔

حکومت اسلامی کی غیر مسلم رعایا کو شرعی اصطلاح میں ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا ہے اور اس لفظ کا
 مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ جو غیر مسلم حکومت اسلامی کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں ان کے حقوق جان و مال کا تحفظ
 حکومت اسلامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے اور اس بنا پر یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں، مگر عداوت دین کی بدذوقی پر قائم
 کرنا چاہئے کہ انہوں نے ایسے مقدس لفظ کو جو غیر مسلم رعایا کے حقوق انسانیت کی تریبانی کر رہا ہے، اتنا
 خوفناک بنا دیا ہے کہ اس کے سنتے ہی جاہل اور نادان قف لوگوں پر لہرہ طاری ہو جاتا ہے۔ فی اللعوب!

حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا سے جس طرح کا مساویانہ اور فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اس کی
 مثال وہ جانہ کسی مملکت میں نہیں ملتی۔ حالانکہ اقوام حاضرہ کا دعویٰ یہ ہے کہ آج تمدن انسانی ارتقاء کی آخری
 منزل تک پہنچ چکا ہے اور ان کے نزدیک سیاست دینی زیادہ نامانی کی مقدس یادگار سے زیادہ وقعت نہیں
 رکھتی اور موجودہ فضا کے لئے اسے ناسازگار بنا دیا جاتا ہے، مگر ان سے کم از کم اتنا تو دریافت کیا جا سکتا ہے
 کہ تو نے آج تک کوئی ایسا نظام سیاست و اجتماع تیار کیا ہے جو ملکی اور غیر ملکی، گورے اور کالے یا اشتراکی
 اور غیر اشتراکی کی تمیز نہ کرتا ہو بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو بلا لحاظ ملک و نسب اور عقیدہ و مسلک مساوی
 طور پر حریت، فکر اور حقوق مذہبیت عطا کرنا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر کیا حرج ہے کہ تم

خلافتِ اسلامی میں قانونی اور عدالتی مساوات | جہاں تک قانونی اور تعزیری مساوات کا تعلق ہے قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں تاکید کی ہے کہ غیر مسلموں سے پورا انصاف کیا جائے۔ اور حقیقت ہے کہ اسلامی عدالت و قانون کی نظر میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تیز نہیں ہے۔

وان حکمت فاحکم مینہم بالقسط ان الله یحب المقسطین (المائدہ) اگر آپ ان (اہل کتاب) کے حکم میں تو عدل و انصاف کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کریں کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو زکوفہ کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں۔
اما بعد فان القضاء فریضة حکمة وسنتہ متبعۃ سباً و بین الناس فی وجهک و عجلک و عدلک (طہمات الفقہار) قضا فریضہ محکم احد واجب الاتباع سنت ہے تم لوگوں کے درمیان اپنے حضور میں اپنی مجلس میں اور عدالت میں مساوی سلوک کرو۔

اسلام نے غیر مسلم رعایا کو جس طرح کے مساوی حقوق دیئے ہیں ان سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی اسلامی شریعت میں مسلمانوں اور ذمی رعایا کے حقوق جان و مال میں کوئی قانونی فرق نہیں ہے۔ اور ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر رکھی گئی ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو شرعی قانون کے مطابق اس مسلمان سے قصاص یا دیت لی جائے گی چنانچہ یہ مسئلہ باقاعدہ قانون کی شکل میں کتب فقہ میں موجود ہے۔

فان بذلوا فلہم ما للمسلمین و علیہم ما علی المسلمین (ہدایہ کتاب الیر)

اگر وہ چیز دینا قبول کر لیں تو وہ ہر طرح کے نفع و نقصان میں مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔

زائد خلافتِ راشدہ میں اسی پر عمل رہا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک مسلمان نے یہودی کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو ایک بڑا سا سخمہ تصور کیا اور فرمایا میرے زائد خلافت میں انسانوں کا خون ہو؟ میں تم کو قسم دلاتا ہوں کہ جسے قاتل کا علم ہو وہ مجھے بتائے۔ بکر ابن شراح نے کہا امیر المؤمنین! اس کا قاتل میں ہوں۔ فرمایا تو پھر تم سے قصاص لیا جائے گا یا اپنی برارت بیان کرو۔

اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے قصاص کا حکم دیا لیکن مقتول کے وارثوں نے قاتل کو معاف کر دیا۔ مگر پھر بھی حضرت علیؓ نے در ثار سے دریافت فرمایا کہ تمہیں کسی نے دھکی تو نہیں دی؟ ورنہ انہ نے کہا کہ ہم نے اپنی مرضی سے اس کو معاف کر دیا ہے کیونکہ اسے قتل کرنے سے ہمارا بھائی زندہ نہیں ہو سکتا اور قاتل نے اس کا سہارا نہ دیا اور پھر حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ کے عہد خلافت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا۔ امیر المؤمنین نے

وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر دو۔ وہ جاہیں تو اسے قتل کریں یا معاف کریں۔ چنانچہ قاتل کو ورثا کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔

مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ تاریخ اسلامی میں اور کئی اس طرح کے واقعات ملتے ہیں جنکی تفصیل اس مقام پر شکل ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے غیر مسلم اقوام کی داخلی عدالتی خود مختاری قائم رکھی ہے۔ چنانچہ بخران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ کتب تاریخ میں مذکور ہے، اس میں اسس کی وضاحت موجود ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق معیشت | حکومت اسلامی میں مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کو بھی تمام اقتصادی اور معاشی حقوق حاصل ہوتے ہیں چنانچہ سطور بالا میں جن معاہدات

کا ذکر کیا گیا ہے ان میں صراحت سے ان کی جائیداد زمین اور دیگر املاک کا ذکر موجود ہے، بالخصوص نصاریٰ بخران سے جو معاہدہ ہوا اس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "وکل ما تحت ایدیکم من قلیل او کثیر" کے عمومی الفاظ سے ان کے حقوق بال کون تسلیم کیا۔

حضرت عمرؓ اپنے عمال حکومت کو بلرباز تاکید فرماتے تھے کہ اہل الذمہ سے کئے گئے معاہدات پر سختی عمل کیا جائے اور ان کی جان و مال پر کسی طرح کی تعدی نہ کی جائے۔ چنانچہ فتح شام کے بعد انھوں نے ابو عبیدہؓ کو تھریہ فرمایا تھا۔

وامنم المسلمین من ظلمهم والاضرار بحمهم واکلھما اموالھم وادف الھم بشرطھم
الذی شرطت الھم فی جمیع ما اتمطیتھم (کتاب الخراج) آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے ان کو نقصان پہنچانے اور ان کا مال غصب کرنے سے روک دیں اور معاہدہ میں جو حقوق آپ نے تسلیم کئے ہیں ان سب کی تکمیل کریں۔

بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے جانشین کو یہ وصیت فرمائی تھی۔

اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بھم (بخاری) میں اس کو اٹھ اور اس کے رسول کے عہد کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں کے حقوق پورے کرے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ کوئی مسلمان ذمیوں کے اموال و املاک کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے تو اس معاملہ میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ان کی زمینیں خریدنا ممنوع قرار دیا، کیونکہ اس سے یہ ممکن تھا کہ تمام زمینیں اہل عرب کے قبضہ میں آجائیں اور ذمی رعایا کسب معاش سے محروم ہو جاتی۔ دولت بنی امیہ کے جابر حکمرانوں نے ذمیوں کی کچھ زمینیں غصب کر لی تھیں اور ان کو شاہی خاندانوں میں جاگیر کے طور پر تقسیم کر دیا تھا، مگر حضرت عمر ابن العزیز نے ایسی تمام زمینیں ذمیوں کو واپس کر دیں، چنانچہ ایک ذمی نے عباس ابن اونیید کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ اس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے عباس ابن الولید سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اس کا کیا جواب دیتے ہو، کہا یہ زمین مجھے ولید نے جاگیر کے طور پر دی ہے اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا کی کتاب ولید کی سند مقدم ہے اور ذمی کو زمین واپس دلا دی۔

اس کے علاوہ حکومت اسلامی میں اہل الذمہ کو تجارت، زراعت اور ہر طرح کے کاروبار کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ زمانہ خلافت راشدہ میں ان لوگوں کو ہر طرح کی کاروباری آزادی حاصل تھی بلکہ ان کو اس سلسلہ میں خاص رعایتیں دی جاتی تھیں تاکہ ملک میں ایشیا، تجارت کی نقل و حرکت وسیع پیمانہ پر جاری رہے اور عوام کو کسی چیز کے حصول میں دقت نہ اٹھانی پڑے۔

دنیا کی کوئی حکومت ایسے لوگوں کو قطعاً معاف نہیں کرتی جو درپردہ

سازشی عناصر سے حسن سلوک

سے یہ ہمیشہ ایک سنگین تر جرم تصور کیا جاتا رہا ہے جس کی سزا قتل یا کم از کم غیر مشروط جلا وطنی ہی ہو سکتی ہے اور دنیا کی حکومتوں میں ایسے لوگوں کے لئے کسی رعایت کا تصور بھی نہیں کیا جاتا مگر خلافت اسلامی کی یہ ماہرہ صد فخر خصوصیت ہے کہ یہ ایسے شریر عناصر سے بھی مہمان کن بہتر سلوک کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے آپ معلوم کر سکیں گے کہ خلافت راشدہ کے مقدس دور میں کئی ایسے قبائل و اشخاص کو جو اس جرم کے مرتکب ہوئے تھے نوعیت جرم کے مقابلہ میں کمتر سزا دی گئی یعنی کافی مہلت دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ ان کو جلا وطن کیا گیا اور پھر اس میں بھی ان کو یہ رعایت دی گئی کہ ان کے املاک و مقبوضات کا ان کو باقاعدہ معاوضہ دیا گیا اور ان کے لئے دوسری جگہ قیام کرنے کا حکومت اسلامی کی طرف سے انتظام کیا گیا۔

عربوں (شام) کے لوگ درپردہ رومیوں سے ساز باز رکھتے تھے، اس علاقہ کے حاکم عمیر ابن سعد نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ ان کے پاس جس قدر جائیدادیں اور مال و مویشی ہیں ان کو باقاعدہ طور پر شمار کر کے ایک ایک چیز کی دگنا قیمت ان کو دیدو اور ان سے کہندو کہ کسی دوسری جگہ چلے جائیں، اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک سال کی مہلت دو، مگر چونکہ وہ اس رعایت کے بعد بھی شرارتوں سے باز نہ آئے اس لئے بالآخر ان کو جلا وطن کر دیا گیا۔

فدک کے یہودیوں کو جس وقت پولیشیل سازشوں کی وجہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان کے باغات اور زمینوں کی پوری پوری قیمت ادا کر دی گئی۔

مگر نجران کے عیسائیوں سے جو بہترین سلوک کیا گیا وہ سب سے زیادہ حیران کن ہے۔ چنانچہ ان کو جب عرب سے نکالا گیا اور شام و عراق میں آباد کیا گیا تو ان کو جو دستاویز لکھ کر دی گئی اس میں ذیل کی رعایتیں مرقوم تھیں۔

(۱) یہ لوگ جہاں قیام کرنا چاہیں وہاں کے حکام ان کو رہائش اور زراعت کیلئے زمین دیں۔

(۲) چوبیس ماہ تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(۳) جن مسلمان کے پاس یہ لوگ فریاد لے کر جائیں وہ ان کی مدد کرے۔

(الفاروق بجاوالہ کتاب الخراج ص ۱۷)

یہ بحث اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو زیرِ تحریر لایا جائے مگر چونکہ یہ ایک مستقل بحث ہے اور ہمارے اصل موضوع (اسلام کا نظریہ جہاد) میں اس کے تفصیلی گوشوں کو کھپانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ غیر موزوں بھی ہے اس لئے اب اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے مگر مذکورہ تصریحات سے اتنا سمجھا جاسکتا ہے کہ جہادِ اسلامی کی غرض و غایت ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ ایسی ریاست قائم کی جائے جو صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حقوقِ انسانیت عطا کرے اور دوسری اقوام و ملل اس کے ماتحت انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم ہوں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہادِ اسلامی کے ذریعہ ایک ایسی مثالی ریاست (آئیڈیل سٹیٹ) قائم کی جاتی ہے جو بلا لحاظ عقیدہ و فکر اور رنگ و نسل تمام انسانوں کو حریتِ فکر، آزاد خیالی، معیشت اور تمام دوسرے حقوقِ مدنی عطا کرتی ہے۔

گذشتہ بحث سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظامِ اسلامی اگر فی الحقیقت اپنے اندر اتنے

نظامِ اسلامی سے غیر مسلموں کی وجہ نفرت

محاسن رکھتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ غیر مسلم نظامِ اسلامی کا نام سننے ہی لرزہ برانداز ہو جاتے ہیں؟ یہ سوال بظاہر وزن دار معلوم ہوتا ہے اور اتنا ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اتنی نفرت کسی چیز سے نہیں ہے جتنی کہ حکومتِ اسلامی کے نام اور بالخصوص جہاد، جزیہ اور ذمی کی اسلامی اصطلاحات سے ان کو نفرت ہے۔ مگر اس شدید نفرت کا باعث چند خارجی امور ہیں جن کا نظامِ اسلامی سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ دورِ خلافتِ علی منہلج النبوة کے بعد حکومتِ اسلامی یا خلافتِ اسلامیہ کے نام سے جو حکومتیں بنتی رہی ہیں ان میں سے بیشتر حکومتیں حقیقت میں اسلامی حکومتیں نہ تھیں اور ان میں وہ سب کچھ ہوتا رہا جو کسی لادینی سٹیٹ میں ہو سکتا ہے مگر چونکہ ان کا ظاہری بیبلِ اسلام ہی تھا اس لئے دوسری قومیں بھی سمجھتی رہی ہیں کہ حکومتِ اسلامی کا نظامِ سیاست ایسا ہی ہے۔ حالانکہ اس میں نظامِ اسلامی کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ تصور ان حکمرانوں کا تھا جو اسلام کے نام سے لادینی طرز پر حکومت کا نظم و نسق چلاتے رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں عقل و بصیرت اور انصاف و دہانت کی جگہ قومی تعصب نے لے لی ہے۔ یعنی اقوامِ حاضرہ کے نزدیک اشیاء کے حسن و قبح کا صرف ایک ہی معیار ہے کہ جو چیز اپنی قوم کی طرف منسوب ہے وہ اچھی ہے اور جو کسی دوسری قوم سے نسبت رکھتی ہے وہ بری ہے، بس اسی معیار پر ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ان کو کسی دوسری دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر مسلمانوں

کے ساتھ ان اقوام کو طبعاً زیادہ عناد ہونا چاہئے کہ انہوں نے مسلسل ایک ہزار سال تمام کفر ارضی پر حکومت کی ہے اور اس عرصہ میں دنیا کی تمام بڑی بڑی اقوام کو طوعاً و کرہاً اقتدار اسلامی کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔ مگر دل سے کوئی قوم فطرۃً اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کی مسند حکومت پر کوئی دوسری قوم قابض ہو جانا پھر یہ قومیں مرکزیت اسلامی کو فنا کرنے کے لئے ابتدا ہی سے درپردہ سازشیں کرتی رہیں اور خود سلم حکمرانوں کی نالائقیوں اور ملت کے غداروں کی وسیع کاریوں نے دشمنان اسلام کے عزائم کو اور زیادہ تقویت بہم پہنچائی (چنانچہ اب بھی مملکت پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اسی دو گونہ کشمکش میں مبتلا ہیں) اور بالآخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے، یعنی مرکزیت اسلامی ان کے ہاتھوں تباہ ہوئی اور شہزادہ ملت بکھر گیا، اور بالآخر وہ وقت پہنچا جس کا ان اقوام کو صدیوں سے انتظار تھا۔ اور اب انہوں نے مسلمانوں سے جی بھر کر انتقام لینا شروع کیا۔ چنانچہ ملت سچی ایک حد تک اس کام سے فارغ ہو چکی ہے اور ہندو اور یہود کو اب اس کا موقع ملا ہے یعنی بیت المقدس کی صلیبی جنگوں، سپانیش کی حسرتناک تباہی، طرابلس الغرب اور سوڈان کے مسلمانوں کے قتل عام، سقوط مصر و شام اور سلطنت ترکیہ کی بریلو کی داستانیں اب پرانی ہو چکی ہیں، مگر یہود کے ہاتھوں فلسطین کی سرزمین اور ہندو کے ہاتھوں ہندوستان، مشرقی پنجاب اور کشمیر کی زمین کا چپہ چپہ مسلمانوں کے خون ناحق سے اب تک لالہ زار بنا ہوا ہے اور فرزند ان توحید کی لاشیں اب بھی کہیں کہیں بکھری پڑی ہیں جو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی سفاکی کی یاد دلا رہی ہیں۔ ہاں مگر ان شہیدان حق کی رو میں بارگاہِ خداوندی میں سرسبز ہو کر فریاد کر رہی ہیں کہ کیا تیری دنیا میں آج کوئی نہیں جو لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون ناحق کا انتقام لے؟

تقدیر کو اتنا یہ کہ دشمنان اسلام دو تین صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی طولانی داستان ہے جو اپنے اندر درد و کرب اور دل آویزی کی متضاد کیفیتیں رکھتی ہے۔

حدیث: درد دل آویز داتا ہے ہست کہ ذوق جیش و دہجوں دراز تر گردد

بہر حال ان اقوام کو مسلمانوں سے اس قدر شدید سیاسی اور مذہبی تعصب ہے کہ ان کی ہلوا ان کے زخمی دلوں پر تنگ پاشی کا کام کرتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے نظام سیاست کو تسلیم کر لیں جو اسلام اور مسلمانوں سے نسبت رکھتا ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک دردناک حقیقت ہے جو الفاظ بن کر زبانِ قلم پر آگئی ہے مگر اس سے مقصد صدیوں کی رقابت کو ابعبارنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ موجودہ اقوام (جن میں مسلمان بھی شامل ہیں) باطنی کی تلخ یاد کو بھلا دیں اور آئندہ کے لئے سوچ سمجھ کر ایسی راہ اختیار کریں جس سے تمام دنیائے انسانیت عیش و آرام اور مسلسل امن و خوشحالی سے بہکنار ہو سکے۔

وہ صرف اسلام کی راہ ہے۔

یہ ہندوستان ہے

(۱) سالم سنٹرل جیل (صوبہ مدراس) کے ۳۳ قیدیوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس پر انھیں قید خانہ کے قانون کی دفعہ ۵۷ کے ماتحت دو دو ماہ سے لیکر چھ ماہ تک مزید قید کی سزائیں دی گئیں۔
(فری پریس جرنل مورخہ ۷؍ ۱۹۱۱ء)

بھوک ہڑتال وہ حربہ ہے جسے مسٹر گاندھی نے عام کیا اور کانگریس اسے ہمیشہ اہم و بلند ترین اصول قرار دیتی رہی۔ آج وہی کانگریس حکومت اسے سنگین جرم قرار دے رہی ہے اور اس کی پاداش میں سزائیں دی جا رہی ہیں! اُس وقت وہ حربہ انگریزوں کے خلاف تھا اس لئے انسانیت کا بلند ترین اصول آج وہ اپنے خلاف ہے، اس لئے سنگین جرم! یہ ہے نتیجہ زندگی کو سنقل اقدار سے الگ رکھنے کا!

(۲) میں 'مسٹر'... کی تجویز سے اختلاف کرتا ہوں... ہندوستان سے، ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفریق ترقی کی راہ میں سنگ گراں ہے۔ جو نہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم (فقط) ہندوستانی ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خوش حالی اور خیرگالی آجائے گی۔
(مسٹر ایم، رئیس، ایچ، قریشی کا خط جو ۳۰ نومبر کے اسٹیشن میں شائع ہوا۔)
اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے!

(۳) حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی صدر جمعیت العلماء اجلاس امر وہب کے خطبہ صدارت میں ارشاد فرماتے ہیں۔
تقسیم ہند کے بعد ہندو فرقہ پرستی پورے شباب پر ہے اور صحیح بات کہنے والا ہندوستانی آج بے اثر ہو چکا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی نے ہمارا گاندھی جیسی بے نظیر شخصیت کی جان لی اور ہندوستان کو نہیں بلکہ دنیا کو سچے رہنما سے محروم کر دیا۔ اس لئے آج کے ہندوستان میں صحیح بات کہنا بہت مشکل ہے۔ مگر سچ کہنا چاہئے اس لئے کہ کبھی نہ کبھی وہ قبول ہی کیا جاتا ہے۔ آج ہندوستان میں فرقہ پرستی کا زہر کانگریس کے اعداد و باہر ترقی کر رہا ہے۔

حکومت ہند کے سامنے اس وقت دو مشکلات ہیں۔ ایک طرف وہ دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ

ہندوستانی حکومت غیر مذہبی حکومت ہے۔ دوسری طرف ہندو فرقہ پرستی سے خائف ہے لیکن اس کی یہ مذہب حالت مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔

(یہ لادھیانوی صاحب وہی بزرگ ہیں جنہیں کانگریس کے مقابلہ میں لیگ میں شرکت پر خالص شرعی اعتراض تھا۔)

(۴) یہاں کے مسلمان اگر انڈین یونین کے وفادار رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ ہندی کو اپنائیں اور ہندوستان کی تہذیب اختیار کریں۔ ان کے اپنے تمدن اور زبان کی اب ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ صوبہ متحدہ کے صدر کانگریس اور صوبہ اسمبلی کے سپیکر راج رشی منڈن جی نے اپنی لکھنؤ اور دہلی کی تقریروں میں بار بار فرمایا اور ایسا وہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ بھوسلے بھائے مسلمان اب جا کر سمجھتے کہ ان کا اطمینان قلب قبل از وقت تھا، جب وہ واقعہ حیدرآباد کے بعد نیت جی دزیر اعظم یو پی کی زبان سے یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ اب مسلمانوں سے وفاداری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں، ابھی تو اپنا تمدن چھوڑنے اور اپنی زبان ترک کرنے کے مطالبات باقی ہیں!

ابھی عشق کے استحال اور مہی ہیں

اور ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ ایسی تقریریں، گاندھی جی کے یوم پیدائش کے موقع پر عین ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں۔
(صدق لکھنؤ ۳/۱۲)

(۵) محاصرہ جمعیت دہلی کے صفحات میں ایک مراسلہ :-

جیسا کہ اندیشہ تھا آخروہ گھڑی آکر ہی رہی اور کل راجستان یونین کا حکم آگیا کہ ٹوٹک کے محکمہ شہر کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک انفرادی اور اجتماعی جو کوشش کی گئی تھی اور جمعیت العلماء نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا اسوس وہ بے سود رہا۔ ان چھ ماہ میں تعطیل جمعہ اور اسلامی تعطیلات کی مسوخی، ذبیحہ گاؤ کی بندش اور بہت سے ملازموں کی برطرفی اور اردو کی جگہ ہندی کو مسلمان پورے صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ لیکن اب محکمہ شہریت کے خاتمہ نے ان کو حد سے زیادہ روحانی تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔

(۶) ہندوستان کا ایک نیشنلسٹ اخبار "حقیقت" لکھتا ہے :-

ہم سے متعدد قوم پرست مسلمانوں نے شکایت کی ہے کہ گزشتہ ستمبر کی شام کو امین الدولہ پارک میں صوبہ کانگریس کے صدر بابو پرشورتم داس منڈن نے گاندھی جی کی سالگرہ کے جلسہ میں جو تقریر

کی وہ بے انتہا مسلم آزار تھی۔ سنڈن جی نے حسب معمول ہندوستان کے مسلمانوں سے اپنا تعلق ترک کر کے بعد ازاں تمدن اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس تقریر کی پوری رپورٹ تو ہمارے پیش نظر نہیں لیکن سنڈن جی جو قسم کی تقریریں مسلمانوں کے خلاف براہ کرتے رہتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ آج کل وہ مسلمانوں سے اپنا تعلق ترک کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کل وہ قرآن مجید پڑھنے سے بھی منع کریں گے کیونکہ وہ بھی ایک بدبشی زبان میں ہے۔ قبلہ رو نماز پڑھنے سے بھی روکیں گے کیونکہ مسلمانوں کا قبلہ (مکہ) ایک غیر ملک (عرب) میں ہے۔ اور بالآخر اسلام ترک کر دینے پر بھی اصرار ہوگا کیونکہ غیر اسلام بھی ایک غیر ملک کے رہنے والے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس جماعت (کانگریس) کا ایک بہت بڑا مددگار ایڈر مسلمانوں کے خلاف ایسی شدید دشمنی اور عداوت کا اظہار کر رہا ہے اس کی تقریریں پڑھنے کے بعد مسلمانوں کو

اس جماعت (کانگریس) کی طرف یقیناً رغبت نہیں ہوگی بلکہ اس سے نفرت ہی ہوگی۔ اس لئے خود کانگریس کے مفاد کے لئے بھی اور نیز مسلمانوں کے لئے ہی بہتر ہے کہ وہ ان جلسوں میں جانے کو قطعی پرہیز کریں جن میں سنڈن جی تقریر کرنے والے ہوں

(۷) - اسے پی آئی کی خبر:-

پٹنہ - ۲۹ مئی ۱۹۳۸ء سرکار ہمارے اعلان کیا ہے کہ صوبہ کے اندر جن میونسپلیٹیوں نے میونسپلوں کے ذمہ کو اپنے حدود کے اندر گائے کے گوشت کی فروخت کو ممنوع قرار دیا ہے انہوں نے اپنے حدود اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ اعلان کا بیان ہے کہ سرکار نے ان احکام کے قانونی پہلوؤں پر خوب غور کر لیا ہے اور فروخت لحم بقری کی ممانعت کے احکام صادر کرنا ہمارا ذمہ میونسپل ایکٹ کے حدود سے باہر قدم نکالنا ہے۔ ایکٹ کے بموجب میونسپل کمیشن ان اس قسم کے احکام صادر کرنے کے بالکل مجاز نہیں۔

اب افسدہ جانے کہ ہمارے صوبہ (پوپی) کا میونسپل ایکٹ ہمارے میونسپل ایکٹ سے کچھ مختلف ہے یا کیا اب تک ہمارے صوبہ میں اس قسم کا کوئی اعلان شائع کرنے کی ضرورت ہماری صوبہ سرکار نے محسوس نہیں فرمائی۔ حالانکہ پڑوس کے صوبہ بہار میں اسے شائع ہونے سے ہفتوں نہیں ہینوں ہو چکے ہیں۔ (صدق لکھنؤ ۱۰/۱۱)

(۸) - نئی دہلی - ۲۰ نومبر آج وزارت کے ایک نمائندہ نے اپنے بیان میں کہا کہ وزارت ہند اور ریاست ہریانہ کے درمیان کسی قسم کا بھی اختلاف موجود نہیں۔ اس دوران میں یہ خبریں شائع ہوئی ہیں کہ سٹیشن فرسٹ

اور ریاست بھوپال کے درمیان شدید اختلافات ہیں، یہاں تک کہ ایک نئے اخبار نے تو یہ بھی چھاپ دیا کہ سرکار ہند نواب بھوپال کو ان کی مخالف ہندو کارروائیوں کی بنا پر حراست میں لے لینی والی ہے۔ یہ خبریں تمام تر بے بنیاد ہیں اور ہماری مندرجہ ذیل ریاست کے درمیان کوئی نزاع ہے ہی نہیں۔

(۱- پی۔ آئی)

خبریں بے بنیاد تو ہو کر ہیں۔ کیا ہماری سرکار واقف نہیں کہ "خبر سازی" خود کتنا بڑا فن ہے اور ہمارے اہل صفت اس فن لطیف کو معراج کمال پر پہنچا چکے ہیں۔ حیدرآباد کا معاملہ کیسو ہو جانے کے بعد ہماری نیوز ایجنسیاں اگر بھوپال کو بھی ہفت ذبنا لیتیں تو آخر بے چاروں کا مشغلہ ہی کیا رہ جاتا؟ کوئی دن مشکل ہی سے ایسا گذرتا ہوگا کہ کوئی نئی سنسنی بھوپال کے لئے تصنیف نہ ہوتی ہو۔ (صدق ۱۰/۱۱)

(۹)۔ دہلی کے مسلمانوں کے جلسہ کا ایک منظر۔

دہلی ۲۰ نومبر بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم کشمیر نے آج جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محاذ کشمیر پر ہندو اور سکھ ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی لڑ رہے ہیں۔ لیکن اس امر کی شکایت کی کہ ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے معاملہ میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جتنی لینی چاہئے۔ حاضرین میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمان مسٹر عبدالغفار قاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ یہ بتائیں کہ آج جب ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم قریب باغ اور سبزی منڈی تک میں نہیں جا سکتے تو پورا مشرقی پنجاب پار کر کے آپ کی امداد کے لئے کیسے پہنچیں۔ مسٹر بخشی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایک غیر مذہبی حکومت کے دارالسلطنت میں ہندو مسلمانوں کے علاقے تقسیم ہیں۔ اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یہ صورت حالات ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں آپ نے امداد اور ارباب حکومت سے بھی گفت و شنید کرنے کا وعدہ کیا۔

(۱۰)۔ پنڈت سندھ لال نے (جامع مسجد دہلی میں) مسلمانوں کو نصیحت کی کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوئی ہو تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہئے جنہوں نے پاکستان نہ پایا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو بے گھر، بے وطن، بے پاکستان اور بے گھر رہے گا ہندوستان کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ پنڈت سندھ لال کی تقریر کے بعد بخشی غلام محمد نے دوبارہ کھڑے ہو کر پنڈت جی کی اس بات سے اختلاف کیا کہ ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہو تو وہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا کفارہ سمجھ کر برداشت کر لیں۔ آپ نے کہا کہ پاکستان والے اپنی حکومت کو ہمیشہ سے ایک مذہبی حکومت بتاتے ہیں۔ وہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں تو کریں۔ لیکن جس ہندوستان میں غیر مذہبی اور جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا ہے وہاں غیر مساوی سلوک کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے صحیح اور جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۱۱) - ۲۸ نومبر آج ایکشن ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا ایکشن۔ ایکشنوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ مقصد کی طرح ایکشن کا نام ہی اس موقع کا ہے جب جائز و ناجائز کا امتیاز اٹھ جائے اور شرافت و ذالت میں تبدیل ہو جائے۔ اپنی پارٹی کے امجدوار کا ہر عیب، بہتر بن جائے اور قریق مقابل کے ہاں کا ہر معمول کا نشانہ بن کر کھٹکنے لگے۔ ۳۵ء کا ایکشن کیا یاد نہیں ہے؟ سر ضیاء الدین احمد مرحوم لائے جا رہے اور نواب محمد اسماعیل خاں ہٹائے جا رہے تھے۔ شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری اور فلاں اور فلاں تے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے۔ وائسرائے بہادر لارڈ ونگلڈن کی زولا زوری کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی۔ بقول شخصے

کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

قوم ہاری لاٹ صاحب جیتے۔ ۱۳ برس کے عرصہ میں دنیا الٹ پلٹ ہو گئی۔ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کا مقدر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آج وہ پھر اپنے عہدہ سے ہٹائے جانے والے ہیں۔ ٹھیک بدیسی سرکار کی طرح سودیشی سرکاری کی طرف سے! (صدق - ۱۷ - ۱۳۸)

(۱۲) - نئی دہلی ۲۳ دسمبر آج دستوری اسمبلی میں جب حقوق مذہب زیر بحث تھے تو ایک ممبر مشر مجمل حسین نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی کہ آئندہ سے اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے، نہ ایسا نام رکھے، نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتہ چل سکے؟ (خبر)

یاد صرف اتنا کر لیجئے کہ اس تجویز کے اس دو قومی نظریہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والی تجویز کے پیش کرنے والے کوئی غیر مسلم نہیں، ایک ہندی مسلمان، صوبہ بہار کے مسلمان ہی تھے! — خدا معلوم توجہ عالی صرف نام، وضع و لباس ہی تک کیوں رہی؟ کیوں نہ ارشاد ہو گیا کہ اپنے کو سر سے سے کسی مذہب سے منسوب کرنے ہی کا شمار غداروں میں ہوگا۔ (ایضاً)

(۱۳) - پنڈت نہرو کا روزنامہ فیشل ہیرلڈ (۹ دسمبر لکھتا ہے -

۶ دسمبر کی رات کو بندہ لیکنڈ جیٹا العلماء کا نفرنس کے جلسہ سے کوئی ۵ ہزار آدمی جن میں ہندو، سکھ، کانگریسی اور سہروردان کانگریس شامل تھے، اٹھ کر چلے گئے۔ جلسہ کی صدارت حافظ محمد ابراہیم وزیر یو، پی کر رہے تھے۔ ناراضی تو عوام میں تقریروں کے فرقہ وارانہ لب و لہجہ کے خلاف تین دن سے ہوا برپا رہی تھی۔ بیانتہا کو اس وقت سنی جب بھی خبر سونی کہ مولانا مدنی صدر جمعیۃ العلماء نے کوئی تقریر مسجد میں کی جس میں انھوں نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ اپنے وضع و لباس میں مسلمان بنے رہیں اور مطمئن اور بے ہراس رہیں، جیسا کہ ان کے پیچترن تنہا کافروں میں رہتے تھے۔ کانفرنس میں کشیدگی قائم رہی جو حافظ محمد ابراہیم اور مولوی بشیر احمد کی ٹھنڈی تقریروں سے بھی دور نہ ہوئی۔“

(۱۴)۔ کانڈھی نگر (اہلاس کانگریس) کا نقشہ الحجیت کی زبانی:

”مختلف دماغوں کے نام اور مختلف دفاتر کے سائن بورڈ ہندی میں لکھے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی آجاتی ہے، لیکن اردو کا کہیں نشان نظر نہیں آتا۔ . . . سب کچھ اس کانگریس میں ہوا جس کے صدر سڈن جی نہیں، ایک خاص کانگریسی بھگت ڈاکٹر سیتا رامیہ تھے۔ اس کانگریس میں ہوا جس کے ڈائریس پربھو سے بڑے ہندوستانی نواز پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز نائیڈو اور سب سے بڑے کرا آقا کھارڈ مولانا ابوالکلام روٹنی، افروز تھے۔ اور ہاں اس کانگریس میں ہوا جس کا مقصد گاندھی جی کے پیام اور کانڈھیوں کو زندہ رکھنا تھا۔ غریب اردو کی داد دے گی جب اس آخری عدالت ایپیل میں بھی نہ ہوئی تو آغراب وہ اپنا سر چھوڑنے کے لئے کونسا آستانہ تلاش کرے؟“

(۱۵) ”ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں اب تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چلیخ دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کشمیش ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ کیا ب ہونے دینگے۔ مسلمان بھائی یا دوسرے لوگ اگر اس دہس میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ہندی کو راسٹر بھاٹا بنانا ہوگا۔ انگریز کے راج میں جو اختلاف تھا ہم اسے باقی نہیں رہنے دینگے۔ لوگوں کو چاہئے کہ پرانی باتوں کو بھول جائیں اور یہ محسوس کریں کہ انہیں نہ صرف اس دہس کی زبان بولنی ہوگی بلکہ جس طرح اس دہس کے لوگ رہتے ہیں اسی طرح رہنا ہوگا۔ متضاد اور مخالف تہذیبوں کیلئے ہمارے دہس میں اب کوئی جگہ نہیں۔“ (مسٹر سکلا وزیر اعظم سی۔ پی۔ جوالہ دھاپ ۱۱/۱۲)

(۱۶)۔ انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر مسٹر مولنکر نے کہا ہے۔

”ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہئے۔“

پھر ارشاد ہے۔

”صاحبزادے زبان کا مسئلہ۔ سوچو کہ اب برطانوی راج ختم ہو گیا ہے اور فرقہ داریا ست بھی رخصت ہو گئی ہے، اس لئے اقلیت کے فرقہ کو اس ضرورت کا احساس کرنا چاہئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے اس بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“

(جوالہ البھیجہ۔ دہلی)

ہاری رپورٹ (سندہ)

از "حارث"

کہتے ہیں کہ انسان کا خون چونکہ نمکین ہوتا ہے اس لئے یہ جن دندسے کے منہ کو لگ جائے چھوٹتا نہیں۔ چار پاؤں پر چلنے والے درندوں کا تو پتہ نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کا خون، دو پاؤں پر چلنے والے درندے (انسان) کے منہ کو لگ جائے تو وہ فی الواقعہ نہیں چھوٹتا۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے اسی خون آشامی کی۔ فطرت نے تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا تھا جس سے عملاً یہ بتانا مقصود تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے سب انسان برابر ہیں۔ لیکن انسان کی اس لذتِ خون آشامی نے انسان اور انسان میں ایسی تفریق پیدا کی کہ علمِ ابحاث (Biology) کی ہزار شہادتوں کے باوجود، مختلف طبقات کے انسان کبھی "ایک خدا" کی مخلوق دکھائی نہیں دیتے۔ انسان کی فطری مساوات کی بنا پر ایک انسان کا کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام و مطیع بنالینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اس کے لئے مستبدانوں کو ہزارا بیسی حربے تراشے پڑے۔ ان حربوں کے انداز مختلف ہیں لیکن ان کی تہ میں اصول ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایک ہی کار فرما رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لو اور جب انسان بھوکوں مرنے لگ جائے تو پھر اس سے جوجی میں آئے کرا لو۔ قرآن کا پہلا ورق اٹھئے۔ اس میں سب سے پہلا فقرہ ربوبیتِ خداوندی کی شہادت دیتا نظر آتا ہے (المحمد للہ رب العالمین)۔ رب کے معنی "پانے والا" ہیں، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ کسی شے کو ابتدا سے انتہا تک جن مراحل سے گذرنا ہوا ان سب میں اس کی پرورش کا سامان مہیا کر دیا جائے۔ کائنات کے مختلف گوشوں پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ ربوبیتِ خداوندی کے اسباب و وسائل اور سامانِ ذرائع کس طرح، کس نظم اور ترتیب کے ساتھ، چار سو کھربے پڑے ہیں۔ سامانِ پرورش کا یہ عالمگیر نظام چار چار کر کہہ رہا ہے کہ زندگی کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے وہی فطرت نے انہیں ہر جگہ پہلے ہی سے مہیا کر رکھا ہے۔ ہوا کو دیکھئے کس طرح ساری فضا اس سے بھر پور ہے۔ سورج کی گرمی اور روشنی کو لیجئے کیسے بے ضرر و معاوضہ سب کو ملتی جا رہی ہے۔ پانی کو دیکھئے، اس کی ہم رسائی کے لئے کیا عمدہ انتظام موجود ہے۔ غذا کو دیکھئے، کس طرح بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی دودھ کے چٹے رواں ہو جاتے ہیں۔ بچپن سے آگے بڑھے تو انسانی غذا کا ذریعہ زمین ہر

آپ سمجھتے ہیں کہ جب زندگی کے ابتدائی مراحل میں پرورش کے تمام ذرائع و اسباب تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر مہیا کر دیئے گئے ہوں تو کیا عمر انسانی کے اس اگلے دور یعنی بچپن کے بعد کی زندگی میں ان ذرائع پر ایسی پابندی لگادی جائیں گی کہ انسان محض زندہ رہنے کی خاطر بار بار اڑا پھرے اور پھر بھی سامانِ زینت مہیا نہ کر سکے؟ یہ خدا کی ربوبیتِ عامہ کے خلاف ہے۔ یہ اس کی رحمت کے منافی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ رزق کے زمینی ذخائر کی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ان کا دروازہ سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ سورہ حم السجدہ میں ذالک رب العالمین (یہ ہے تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا) کہہ کر فرمایا:

وجعل فیہا رواسی من فوقہا وبرزخ فیہا وقد رفیہا اقواتہا فی ارجتہ ایام۔
سواء للسانلین۔ (۱۱۶)

وہ خدا جس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھ دی (کہ جتنا جی چاہے اسے نکالتے جاؤ۔ اس کا ذخیرہ ختم ہی نہ ہونے پائے) اور اس کی فصلوں کا اندازہ مقرر کر لیا۔ اور اس کی اس طرح تخلیق چار مراحل میں کی۔ (زمین) ہر ضرورت مند کیلئے یکساں طور پر موجود ہے۔

جس طرح ہوا کا ذخیرہ ہر سانس لینے والے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی ہر دیکھنے والے کے لئے مساوی حیثیت سے موجود ہے۔ جس طرح پانی کے چھتے اور ندیاں ہر پیا سے کے لئے بلا روک ٹوک جاری ہیں۔ اسی طرح زمین میں غذا کے ذخیرے ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر محفوظ ہیں۔ جو محنت کرے، اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ یہ وایۃ فطرت کا سامانِ پرورش ہے۔ یہ ربوبیتِ خداوندی کا خزانہ بیغا ہے۔ والادض و صنها للانام (۱۱۷) زمین کو خدا نے نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ جب تک انسان کی فطرت کو ابلیمانہ ہوس کاریوں اور خیشانہ کام جڑوں نے ملوث نہیں کیا، اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ زمین پر بھی کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے۔ لیکن مستبدانوں کی ہوس خون آشامی نے اسے بھانپا کہ جب تک انسان کو بھوکا نہ مارا جائے یہ دوسرے انسان کا غلام نہیں بن سکتا۔ اس لئے انھوں نے اس کے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ قضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی اور روشنی تو اس کے دستِ تطاول کی رسائی سے باہر تھی۔ اس لئے وہ تو محفوظ رہ گئی (اور کسی حد تک پانی بھی) لیکن زمین پر سانپ بن کر بیٹھ جانا تو اس کے لئے ممکن تھا۔ یہ اس نے کیا اور بڑے دھڑلے سے کیا۔ اور اس طرح اپنے جیسے انسان کو اپنے سامنے جھکایا۔ نظامِ انسانیت میں وہ دن شرفِ انسانیت کے لئے سب سے زیادہ منحوس اور ابلیمانہ فتنہ دی کے لئے سب سے بڑھ کر مبارک تھا جب پہلے پہل کسی انسان نے زمین پر اپنی ملکیت کا دعوئے کیا۔ بس اُس دن سے اس زمین پر جو اس سے پہلے انسانیت کی پرورش کے لئے گوارا جنت تھی، فساد کی بنیاد پڑی جس نے ہر طرف جہنم کے شعلے بھڑکا دیئے۔ بایں نطقہ مظلوموں اور مندوں کے مسلسل آئسٹوں کی بارش کے باوجود وہ شعلے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ وہ اھم بخارجین من النار۔

قرآن آیا اور اس نے اس جہنم کو بھر سے جنت میں بدلنے کے فطری طریق سے انسانوں کو آگاہ کیا اور

صاحبِ قرآن (علیہ التیۃ والسلام) نے اپنے بے مثال عمل سے اس تبدیلی کو مشہور دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن فخلف من بعدہم خلف، ان صاحبانِ علم و عمل کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ اضا عوا الصلوٰۃ وابتعوا الشہوات۔ انہوں نے فطرت کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنی ہوسناکیوں اور کامزانیوں کے پیچھے لگ گئے۔ فسوف یلقون عذاباً دہیلاً، فطرت کے اہل قانون کے مطابق ملکیت نے انہیں پھر سے گھیر لیا اور پھر وہ جنتِ ارضی جہنم سے بدل گئی۔ چنانچہ آج قرآن کے نام لینے والوں اور انہی اسلاف کے نام پر اپنے نام رکھانے والوں کی حالت یہ ہے کہ بڑے فخر و تکبر سے کہتے ہیں کہ میں دس ہزار ایکڑ زمین کا مالک ہوں اور میں یہاں کا سب سے بڑا زمیندار ہوں اور میں شرماتے کہ ان کے اس اعلان سے کس طرح انسانیت کی آنکھیں زمین میں گر جاتی ہیں۔ ان دس ہزار ایکڑ زمین کے مالکوں کے ہاں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے، اگر آپ اس کی ایک جملک دیکھنے کی تاب لاسکتے ہیں تو دور نہ جائیے۔ یہیں سندھ کے کسی گاؤں میں نکل جائیے اور وہاں دیکھئے کہ خدا کی جس مخلوق کو ہاری کہا جاتا ہے اس پر کیا قیامت گذر رہی ہے (یہ لفظ عارث، بمعنی کاشتکار کی مسخ شدہ صورت ہے۔ یعنی ان بچاروں کی صورت اور سیرت کے ساتھ اس لفظ کا بھی حلیہ بگڑ گیا ہے جس سے انہیں متعارف کیا جاتا ہے) گرمیوں کی چٹھلائی و صوب اور سردیوں کے کپکپاتے جاڑے میں شبِ دروز کام کرنے والا یہ مزارع، ایک چلتی پھرتی مشین دکھائی دیکھا جس کی حالت یہ ہے کہ اگر کڑتا ہے تو تہمد نہیں اور تہمد ہے تو جوتا نہیں۔ ایک خستہ و خراب جھونپڑا (جواکڑ موٹیوں اور انسانوں کا مشترکہ مسکن ہوتا ہے) اور اس میں چند مٹی کے برتن، دو تین کھانا اور کچھ پیٹے پرانے محاف۔ یہ ہے اس کی کل کائنات۔ وہ ہر وقت زمیندار کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتا ہے کہ نہ جانے اس کا مزاج شاہانہ کس بات پر برہم ہو جائے اور اس بچارے کو اس کی کھڑی فصل سے کان پکڑ کر باہر نکال دے۔ فصل پکنے پر سب کی سب زمیندار کے کھلیا نوں میں جا سہتی ہے اور وہاں وہ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے بتائے ہوئے قاعدوں کے مطابق اس کی بنائی کرتا ہے جس میں

از صحن خانہ تا لب ہام از ان من از ہام خانہ تا بہ ثریا از ان تو

کا اصول پر نظام پر جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اگر راری بچارا کسی بات پر بھی زبان کھولے تو دوسرے دن حوالا میں نظر آتا ہے۔ گاؤں زمیندار کا ہے۔ گاؤں والے زمیندار کے ہیں۔ پولیس زمیندار کی ہے۔ قانون زمیندار کا ہے۔ عدالت زمیندار کی ہے۔ اور فسادِ آدمیت کے ان متنوع زنجیروں میں جکڑا ہوا مظلوم و مقہور اور مجبور و مجہول ہاری، ازمہ مظلوم کے عہد غلامی کی زندہ تصویر آپ کے سامنے۔ چونکہ یہ خود زمیندار کا ملک ہے اس لئے اس کی ہر شے زمیندار کی ملک ہے۔ نہ صرف اس کی محنت و مزدوری کا ماحصل ہی بلکہ اس کی عزت و آزادی بھی۔ نہ کسی غریب کی ہوا اور نہ ہی کی ناموس محفوظ ہوتی ہے نہ بہن اور نہ بیوی کی عصمت۔ ان مظلوموں کی تساع و ملک کا خون زمیندار کے عشرت کدہ کے لئے سامانِ زمینت بنتا ہے۔ اگر کسی کی غیرت نے ذرا بھی مداخلت کی تو پھر اس کے بعد دنیا نے اس کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ یہ افسانے نہیں، حقیقتیں ہیں اور یہیں آپ کے

گرد و نواحِ نثری اور پھر کئی نظر آ رہی ہیں۔

شروع ۱۹۴۷ء میں جب سندھ اسمبلی کے ایکشن کے بعد وزارت کے جھگڑے میں کھوڑا اور غلام حسین (مرحوم) ماہی رسد کئی شروع ہوئی ہے تو محترم قائد اعظم سندھ میں تشریف فرما تھے۔ عین اسی زمانہ میں یہ خبر خاص حلقوں میں چکر لگا رہی تھی کہ سندھ کے زمینداروں کے مظالم و استبداد کی انسانیت کش داستانیں محترم قائد اعظم تک پہنچی ہیں، جن سے متاثر ہو کر انہوں نے چاہا ہے کہ حقیقتِ حال کی تحقیق و تفتیش کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ سندھ اسمبلی کی سفارش کے مطابق مارچ ۱۹۴۷ء میں "ہاری کمیٹی" کا وجود عمل میں آیا۔ کمیٹی کے صدر سر راجہ تاج مس تھے جو ایک مدت سے سندھ کے وزیر زراعت (ملا تخواہ) چلے آ رہے تھے اور جو سندھ کے ضلع میرپور خاص میں خود وسیع اراضی کے مالک ہیں۔ اس کے ایک ممبر مشر صدیقی (عیسائی) سندھ پبلک سروس کمیشن کے رکن اور دوسرے ممبر نواب شاہ کے کھلٹر، مشر مسعود (آئی۔ سی۔ ایس) تھے۔ سر راجہ اور صدیقی صاحب تک کی بات تو قابلِ فہم تھی لیکن مشر مسعود کی رنگیت کی رسمِ اربابِ فکر و نظریں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسعود جیسے قرآنی مسلمان اور سر راجہ جیسے قارونی زمیندار کا ساتھ آگ اور پانی کا میل ہے جو کبھی بچہ نہیں سکتا۔ لہذا اس کمیٹی کی تعمیر میں ہی خرابی کی صورت حاضر تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہاریوں کی مظلومیت کی داستان مسعود صاحب کے ذریعہ ہی محترم قائد اعظم تک پہنچی تھی اور اسی کے دل کی دھڑکنیں اس اقدام کی محرک ہوئی تھیں۔

مسعود کو دنیا ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر کی حیثیت سے ہی جانتی ہے لیکن راقم الحروف اس سنگین حصار کے اندر چھپے ہوئے اس چشمہ صاف و شیریں سے بھی واقف ہے جسے ایک مسلم نوجوان کا قلب مصفا کہا جاتا ہے۔ جو ہر مظلوم کی مصیبت پر تڑپتا اور ہر ظالم کے جور و استبداد پر پھرتا ہے۔ مسعود کو زمانہ طالب علمی ہی سے قرآن سے ذوق تھا۔ عربی میں اس کی استعداد اپنے ہم دستاؤں سے بہت آگے تھی۔ قانون کے امتحان (ایل ایل بی) میں وہ پنجاب بھر میں اول نمبر آیا۔ (بلکہ اس نے ریکارڈ قائم کیا)۔ اُس زمانہ میں ہی اس کی حالت یہ تھی کہ وہ گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر پھرتا اور مسلمانوں کو عزت و شوکت اور دیانت و امانت کی صحیح اسلامی زندگی کی دعوت دیتا، راستہ چلتے جو کچھ مل جاتا کھا لیتا اور جہاں ملات آتی وہیں زمین پر سوجاتا۔ یہ فقارِ یوانگی اور فرزانگی کا وہ مجسمہ مسعود جو بعد میں آئی۔ سی۔ ایس کا افسر بنا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملازمت کی پابندیاں بڑی حد تک ان عزائم کی راہ میں غماں گیر ہو جاتی ہیں جو اس قسم کے دل و دماغ رکھنے والے نوجوان کے دل میں موجزن ہوتے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ

ہری رُو تاپ مسوری ندارند چو در بندی ز روزن سر بر آرنند

چڑھتی ہوئی ندیوں کو اگر بڑھنے سے روک دیا جائے تو وہ کنوئیں اور چشموں کے راستے سر نکال لیتی ہیں۔ حکومتِ بمبئی نے مشر مسعود کو ۱۹۴۷ء میں، خاندیش میں بھیلوں کے اصلاح کے کام پر متعین کر دیا۔ گوئڈ اور بھیل

اور اسی قسم کے دیگر وحشی قبائل، درحقیقت اس جو رو قہر بانیت کی زندہ یادگار میں جو بندوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں یہاں کے اہل باشندوں پر روا رکھا تھا، ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک مسلمان نوجوان جس کے دل و دماغ کی تعمیر صحیح قرآنی اصولوں پر ہوئی تھی، ان کی خون رلا دینے والی حالت کو دیکھتا اور اس کا قلب حساس، ان کی مظلومیت کے درد اندوہ سے بچھل نہ جاتا۔ تین سال میں مسعود نے وہاں جو کام کیا وہ اس حقیقت کی رتہ شہادت ہے کہ اگر کرنا چاہے تو ایک مسلمان تنہا بھی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ داستان بڑی دلچسپ اور مواعظ آمیز ہے اس لئے اسے ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مقصود اس سے مسر مسعود کی مرحمت سرائی نہیں بلکہ اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ ایک درددل رکھنے والا مسلمان جمہوریوں کے باوجود کیا کچھ کر سکتا ہے۔

بھیلوں کو مذہبی شعور نہ تھا اور وہ قدیمی رسومات کو زندگی کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ ہندو ماہیوں اور کانگریس نے ۳۰-۴۰ سال کی متواتر کوششوں سے بھیلوں کو ہندومت میں داخل کیا اور یہ لوگ اپنے آپ کو ہندو کہلانے لگے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق پہلے اچھے جذبات تھے لیکن اب ہندو اثر کے ماتحت یہ لوگ مسلمانوں کے سخت دشمن ہو گئے اور انھوں نے خاندانوں کے علاقہ میں سینکڑوں مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کے تھے۔ ان حالات میں حکومت بمبئی نے مسر مسعود کو بھیلوں کی اصلاح کے لئے منتخب کیا۔ بھیلوں کی سرکشی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انھوں نے افسروں تک کو بھی قتل کر دیا تھا اور انگریزوں کی ابتدائی تاریخ میں انھوں نے انگریزی افواج کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

اس فضا میں جو کام مسر مسعود کے لئے تجویز کیا گیا وہ سخت مشکل اور خطرناک تھا۔ لیکن تین سال کی شبانہ روز محنت اور انتھک مخلصانہ کوششوں سے مسعود نے بھیلوں کو اپنا پاپا اور اپنی حسن کارگزاری اور بے لوث خدمت سے غریب بھیلوں کو اقتصادی زہوں حالی سے نجات دلائی۔ ہندو ساہوکاروں کا قلع قمع کیا۔ افسروں کی بیجا بیگاری اور ظلم سے خلاصی دلائی۔ اور ان کی ہرنکا لیف کا فوری علاج کیا۔ طبی امداد کا اور سکولوں کا جا بجا اجراء کرایا۔ اس مقصد کے لئے مسر مسعود نے بھیلوں کے قدیمی کلچر اور زبان سے پوری واقفیت پیدا کی اور ان کے دیوتاؤں کی روایات اور رسومات اور پسندیدہ باتوں پر پورا عبور حاصل کیا۔ یہ کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن اس کے بغیر کام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی زبان اور معاشرت سے آگہی حاصل کرنے کے بعد مسر مسعود نے اپنی طرز معاشرت کو بالکل بدل کر عام غریب بھیلوں کی معاشرت شروع کر دی۔ ۱۵۰۰ انہی میں رہتے رہتے اور ان کی خدمت کے لئے بڑے بڑے دشوار اور مخدوش جگہوں کو ۲۰-۲۰-۲۰-۳۰ میں پیدل قطع کر کے ایک ایک کو نہ اور گوشے میں پہنچتے۔ بیماروں کی تیمارداری اپنے ہاتھوں سے کرتے اور سامان خوراک، عام ضروریات کی چیزیں اور دوائیں وغیرہ ان مفلوک اور حسنتہ حال مریموں کو بھیجا کرتے۔ ان باتوں نے بھیل اقوام کو ان کا گردنہ بنا دیا اور تمام قوم ان کے پیچھے لگ گئی حتیٰ کہ انھیں مسعود مہاراج اور مسعود بھگوان کے نام سے پکارنے لگی اور لاکھوں کی تعداد میں بھیل ان کے جاں نثار بن گئے۔

ابتدائی مراحل کا یابی کے ساتھ ملنے کرنے کے بعد مسعود نے بھیلوں کے جداگانہ شخص کی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا مقصد بھیلوں کو ان کا میاں زندگی بلند کر کے ابھارنا تھا۔ ہندومت میں داخل ہو جانے سے بھیلوں کے دل میں احساس کسری بہت شدت کے ساتھ گھر گھر گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت نیچا سمجھنے لگ گئے تھے اور ہندوستان نے انہیں بیچ قوموں کا درجہ دیدیا تھا۔ یہ دھڑو موسوں کر کے کہ بھیل لوگ بھی ہندومت کا شکار ہونے کے بعد اجموت قوم میں داخل ہو جائیں گے۔ اور اس قدر ذلت سے ان غریبوں کو بچانا لازمی ہے مسعود نے بھیل قومیت کی تحریک کی بنیاد رکھی اور ایک بھیل قومی ترانہ بنایا جس کے یہ الفاظ تھے۔

ہم بھیل بہادر بھیل جگھوں کے راجہ شیروں کے بچے۔ نہ ہم کسی سے کم۔ ہم سب سے اونچے۔

یہ قومی ترانہ بہت جلد بھیلوں میں مقبول ہو گیا۔ حتیٰ کہ بچے بوڑھے جوان سب یہ ترانہ گانے لگے اور ان کے ساتھ ہی بھیل جمہوری کی بے "کانفرہ بھی بلند ہوا۔ بھیل قوم میں بیداری کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔ کانگریس اور جہاں بھیلوں کے علاقہ میں چار پانچ سو سکول کھول رکھے تھے جن میں بھیل بچوں کو ہندومت کی تعلیم دی جاتی تھی اور بندے ماترم کے گانے گائے جاتے تھے۔ بھیل قومی ترانہ جو بھیلی زبان میں تھا اس زور شور سے پھیلا کہ اس نے بندے ماترم اور دوسرے ہندو گانوں کو بھیلوں کے دماغ سے نکال باہر کیا۔ اور بھیلوں میں قومی شعور کے ماتحت ہندو سرمایہ دار کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ ہندو سرمایہ داروں نے مدت دراز سے نیچے پھیلانے ہوئے تھے اور بھیلوں کو اپنی اقتصادی غلامی میں جکڑ رکھا تھا بھیلوں کی تقریباً آدھی زمینیں سرمایہ داروں کے قبضہ میں جا چکی تھیں۔ قومی تحریک کا لازمی نتیجہ تھا کہ بھیل ہندو سرمایہ داروں کے برخلاف کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں ہندو سرمایہ داروں کے مارے بھاگ گئے۔ قومی تحریک آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور ہندوں اور بھیلوں میں مختلف مقامات پر تصادم ہوا۔ اس وقت کانگریس اور ہندو جہاں بھیلوں کے برخلاف سارے مہی کے پرنس میں زبردست جنگاں برپا کر دیا۔ متواتر چار مہینے تک اخبارات میں بڑی بڑی جھڑپیں سرخوں کے ساتھ مختلف مضامین مسعود کے برخلاف شائع ہوئے اور سارے پرنس نے بڑی شہداد کے ساتھ مطالبہ کیا کہ حکومت مسعود کو تبدیل کرے کہ ان کے برخلاف انکو آئری کرے اور نوکری سے معطل کرے۔ ایسا بلاخبر شکار آج تک کسی سیاسی لیڈر کے برخلاف بھی اخبارات میں نہ ہوا تھا۔ مسعود کے خلاف فہرست الزامات میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ بھیلوں کو ہندومت سے نکال کر اسلام میں لے جا رہے ہیں۔ کانگریس کے بڑے بڑے زعمائے بھی اس معاملہ میں دخل دینا اور گھبرائیں سہی سر جان کالوہیل کو مسعود کے برخلاف بہت کچھ بوجھ لایا اور کہا سنا۔ حکومت کو مسعود کے کام سے پوری واقفیت تھی۔ مسعود نے اپنی صداقت کا ثبوت دینے کیلئے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر کانگریس ان کے ساتھ زور آزمائی کرنا چاہتی ہے تو بھیلوں کے علاقہ میں مسعود گاندھی کیوں کے خلاف ایکشن میں لایا جاوے، اگر وہ ایک کے مقابلہ میں دس کے فرق کر

گاندرمی کو نہ ہرادی تو حکومت بمبئی انھیں نوکری سے علیحدہ کر دیوے۔ مسٹر مسعود کی یہ تحریر حکومت بمبئی کے پاس پہنچ گئی۔ گورنر صاحب نے اس کی نوٹ نہ آنے دی اور مسٹر مسعود کو بلا کر کہا کہ وہ ان کے کام سے بخوبی واقف ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں بھیل ان کے پیچھے ہیں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ بالآخر حکومت بمبئی نے مسٹر مسعود کی حمایت میں ایک پریس نوٹ شائع کیا جس میں تمام الزامات کی تردید مسٹر مسعود کے کام کی تعریف اور ان میں حکومت کے کامل اعتماد کا اظہار تھا۔

کانگریس کا پریس جو مسٹر مسعود کی معطلی کے احکام کا سخت مطالبہ کر رہا تھا۔ اس نوٹ سے نہایت خیف ہوا۔ ہندو صاحبان نے پورے اور پروڈنشل کانگریس کمیٹی نے مقام بلدیہ سے زبردست ریزولوشن پاس کئے اور مسٹر مسعود کی نوکری سے برخاستگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن گورنمنٹ کے پریس نوٹ کی وجہ سے انھیں سخت منہ کی کھانی پڑی۔ اب حکومت کے اس پریس نوٹ کے خلاف کانگریس کے اجازات نے شور مچایا ہر ایک اجارے کے پہلے صفحہ پر روزانہ ایک سرخی شائع ہوتی کہ کانگریس حکومت جب براقتدار آئے تو سب سے پہلے مسعود کے معاملہ کی تحقیق کرے اور بمبئی کے گورنری نوٹ کو منسوخ کرے۔ یہ واقعات اکتوبر نومبر ۱۹۴۶ء میں رونما ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں کانگریسی حکومتوں کے آنے کی خبر آئی۔ اس وقت گورنر بمبئی نے مسٹر مسعود کو بلا کر کہا کہ ان کا تبادلہ صوبہ سندھ کیا جا رہا ہے۔ مسٹر مسعود نے انہار ناراضگی کیا لیکن گورنر نے کہا کہ انھیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہیل نے کانگریسی وزیر اعظم کچھ کو خاص ہدایت کی ہے کہ جرنی وہ قلمدان وزارت سنبھالے مسٹر مسعود کے معاملہ کو از سر نو اٹھاوے۔ گورنر کو سخت تشویش تھی کہ ایسا ہونے سے ایک آئینی تعطل کا خطرہ پیدا ہو جائیگا اور ان کی پوزیشن سخت کشمکش میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ وہ اپنے پریس نوٹ میں مسٹر مسعود کو حق بجانب قرار دے چکے تھے۔ اولاً کانگریس نے ان پر معاملہ اٹھایا تو ان کے پہلے پریس نوٹ کے خلاف ان کو فیصلہ دینے پر کانگریس وزارت مجبور کرے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وزارت اور گورنر میں اختلاف پیدا ہوگا۔ لہذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ مسٹر مسعود سندھ چلے جائیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر مسعود نے حکومت بمبئی کو خیر باد کہا اور ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو وہاں کانگریسی حکومت قائم ہوئی۔

بھیل قومیت کی تحریک سے بھیلوں اور ہندوؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھیلوں نے مسلمانوں کی پناہ لی۔ ہندوؤں سے اس قدر بیزار ہوئے کہ ان کا سب سے بڑا لیڈر رومال جی کاوت جب سخت بیمار ہوا اور اس کے عزیزوں نے ہندو اکثریوں کو بلانا چاہا تو اس نے کہا مجھے ہندو اکثر نہیں چاہئیں وہ مجھے زبردستی مار ڈالیں گے۔ کوئی مسلمان حکیم بلاوؤ۔

معتقرا یہ کہ اس تین سال کے عرصہ میں مسٹر مسعود نے ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس کا اعتراف خود ہندوؤں کو بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۵ء کے اسٹریٹوڈیو (بمبئی) میں مسٹر ایم کرشنا نے بھیلوں کے اس انقلاب کی تفصیلی داستان کی ابتدائی الفاظ سے کی۔

یہ داستان ہے اس معاشی-معاشرتی معجزہ کی جس نے بھیلوں جیسی مظلوم بے کس و بے بس، قابل رحم، جردا استبداد کے ہاتھوں مٹی ہوئی قوم کو، واجب العزت، قابل فخر اور خود آکام انسانوں کا گروہ بنا دیا۔ ایسے انسانوں کا گروہ جو اپنے قبائلی کلچر اور روایات کو قابل شرم محسوس نہیں کرتے۔ جنہوں نے اپنی گم گشتہ روح کو پھر سے پایا ہے اور جو اب اپنی ترقی کی شاہراہ پر نہایت عزم و استقلال سے گامزن ہو رہے ہیں۔ جس آدمی کے ہاتھوں یہ معجزہ عمل میں آیا ہے وہ مرشد مسعود آئی سی ایس ہے جسے بھیل مسعود مہاراج کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا نام آج تین لاکھ بھیلوں کے ہر ایک گھرمیں گونجتا اور ان کے گیتوں اور نعروں میں گرجتا ہے۔

ہم اس تفصیلی داستان کے تذکرہ سے معذرت چاہتے ہیں لیکن اس کے بعد آپ یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ ایک مخلص مسلمان مجبور یوں کے باوجود کیا کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تذکرہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ اس پس منظر کے بغیر یہ بات آسانی سمجھ میں نہیں آسکے گی کہ ہاری کمیٹی میں مسعود صاحب نے کیا کیا اور اب حکومت نے جو کچھ ان کی رپورٹ کا حشر کیا اس کی وجہ کیا ہے!

اس کا گزاری کے ساتھ مرشد مسعود سندھ آئے اور نواب شاہ کے کلکٹر مقرر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سندھ میں الیکشن کا ہنگامہ گرم ہونے والا تھا۔ یہ الیکشن کوئی معمولی الیکشن نہ تھا۔ یہ وہ الیکشن تھا جس پر پاکستان کے مطالبہ کی فتح و شکست کا دار و مدار تھا۔ نواب شاہ، مرشد اور ان کی پارٹی کا حصن حصین تھا۔ اس قلعہ کا توڑنا بہت ضروری تھا۔ مرشد مسعود کے سامنے ایک طرف ملازمت کی پابندیاں تھیں اور دوسری طرف مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے مستقبل کا سوال۔ مسعود کا فیصلہ ظاہر تھا۔ اس کے بعد اس گر مجوش نوجوان نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم سے نہیں، سندھ کے ہندو پریس سے پوچھئے۔ سندھ آج زور نے اپنے مفاد اقتصادی میں جھلا کر بہانگ لکھ دیا کہ

مسلم لیگ کی حمایت کے سلسلہ میں مرشد مسعود کے خلاف جو کچھ پریس میں شائع ہوا ہے اگر اس کا عشر عشر بھی صحیح ہے تو نہ صرف یہ کہ اس افسر کو فوراً نواب شاہ سے تبدیل کر دینا چاہئے بلکہ اس کے خلاف جو ڈیشنل انکوائری شروع کرنی چاہئے اور مجرم ثابت ہونے کی صورت میں اسے ملازمت سے برطرف کر دینا چاہئے۔ (سندھ آج زور مورخہ ۱۳ اپریل)

بہر حال لیگ کے مخالفوں کو شکست ہوئی اور اس سرزمین پر جسے باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل تھا، پاکستان کا جھنڈا اگڑا گیا۔

بھیلوں کی تحریک اور مسلم لیگ کی حمایت کی بنا پر ہندوؤں کے دل میں مرشد مسعود کے خلاف کس قدر آتش انتقام شعلہ زن تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تقسیم ہندوستان کے بعد جب ہندو اپنی منظم اسکیم کے ماتحت سندھ سے عازم ہندوستان ہوئے تو مرشد مسعود نواب شاہ کے کلکٹر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص

غیر مسلم بھیلوں کی خدمت میں خون پسینا ایک کر دے، وہ سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ کس طرح ظلم روا رکھ سکتا ہے۔ ایک مسلمان کے ہاتھ سے ظلم ناممکن ہے کہ اس کا خدا سے دشمن سے بھی عدل کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندو پرپس میں مشر مستعود کے خلاف ایک کہرام مچا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ مشر کا باا اپنی رسوائے عالم کتاب ... (Inside Pakistan) میں ضلع نواب شاہ میں مظالم کے بہت سے فرضی افسانے درج کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ یہ اسی مستعود کے کارنامے تھے جو اپنی بد نظمی کے لئے ایک مدت سے بدنام چلا آ رہا ہے۔ (۲۳ ص)۔ حتیٰ کہ مشر گاندھی نے ایک شام اپنی پارٹیا میں بھی مشر مستعود کو نہ جس کے فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اور پروفیسر ملکائی ڈبئی ہائی کورٹ نے انڈیا میں پاکستان نے یہاں تک لکھ دیا کہ گلکشر نواب شاہ کا نام بطور ایک خوفناک بھوت کے لوک گیتوں میں مشہور ہو جائے گا اور آنے والی نسلیں اس نام سے اپنے بچوں کو ڈرایا کریں گی۔ (سندھ آنرز راولپنڈی) یہ سب بھیلوں کی تحریک اور پاکستان کی حمایت کی بنا پر ہندو ذہنیت کے جذبات غیظ و غضب کے مظاہرے تھے۔ لیکن لیگ کا کام ایک وقتی کام تھا۔ مشر مستعود کے سامنے یہاں پھر ظلم و مظلومیت کی ایک انسانیت سوز کشمکش تھی جو زمیندار اور ہاری کی شکل میں وجہ تنگ آمدیت تھی۔ ہاریوں کی مظلومیت بھیلوں سے کہیں کم نہ تھی اس لئے ہونے لگا تھا کہ مستعود ان کے اس زبوں حالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اس کا دل ٹرپ نہا تھا۔ اس نے اپنے گلکشری کے زمانہ میں ان غریبوں کی ہمدردی میں کیا کچھ کیا اس کی تفصیل ضلع نواب شاہ کے کسی ہاری سے سنئے۔ خاندان میں بھیلوں کے تباہ کرنے والے ہندو سرمایہ دار تھے۔ اور جہاں حالت یہ تھی کہ ہاریوں کا خون چوسنے والے خود مسلمان سرمایہ دار۔ لہذا یہاں کام مشکل ہی تھا اور بڑی حد تک خطرناک بھی۔ لیکن مشر مستعود نے اپنی بے لوث ہمدردیوں سے یہاں بھی مظلوم ہاریوں کے دل میں گھر کر لیا۔

بہر حال یہ تھے مشر مستعود آئی۔ سی۔ ایس۔ جو باری کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور جنہیں سر راجہ رامس کی زیر صدارت، زمینداروں کی دمازدستیوں کے خلاف ہاریوں کی فریادری کا فریضہ سونپا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے! شروع شروع میں (سنہ ۱۹۷۶ء) مشر مستعود نے مستعود صاحب کا ساتھ دیا اور اس طرح صاحب صدر کو اپنے خیالات سنوانے میں ناکامی ہوئی۔ اس طرح آٹھ مہینے گزر گئے اور جب سر راجہ کو محسوس ہونے لگا کہ اکثریت کی رپورٹ ان کے خیالات کی موید نہیں ہو سکے گی تو مشر مستعود کے حکم سے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ایک چوتھے ممبر (مشر فلام رسول نہر) کمیٹی کے ساتھ چکا دیئے گئے۔ یہ صاحب ضلع لاڑکانہ کے ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے اضافہ سے سر راجہ کو بڑی تقویت ملی اور ان کے متحدہ محاذ نے ایسا زور پکڑا کہ مشر مستعود یعنی بھی اس کے حریف نہ ہو سکے۔ اب مشر مستعود اقلیت میں رہ گئے۔ ہم نے سنا یہ ہے کہ سر راجہ کمیٹی کی دوسری یا تیسری نشست میں ہی ایک رپورٹ مرتب کر لائے تھے یہی رپورٹ، بادی تعمیر و تبدل اس طرح حاصل کردہ اکثریت کے زور پر منظور کر لائی گئی۔ فروری ۱۹۷۷ء میں یہ رپورٹ حکومت کو بھیج دی گئی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مشر مستعود اس رپورٹ کے حامیوں میں سے کیسے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اس دوران میں بہت سی اڑتی ہوئی خبریں فضا میں پھیلتی رہیں کہ

کس طرح مسٹر مسعود پر باؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ سر راجر کی ہاں میں ہاں ملادے لیکن مسعود نہ مانتا تھا اور وہ نہ مانا۔ ایسے نامساعد حالات میں مسٹر مسعود نے اپنی "اقلیت رپورٹ" مرتب کی جسے غالباً میجی باجون میں حکومت تک پہنچا دیا۔ آئین جمہوریت کی رو سے، اقلیت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلہ کے خلاف اپنی آواز اٹھائے اور اگرچہ فیصلہ اکثریت ہی کی رائے کے مطابق ہوتا ہے لیکن اقلیت کی اس آواز کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن حکومت سندھ نے جمہوریت کے اس مسئلہ آئین کو پائے استکبار سے ٹھکرا دیا اور اکثریت رپورٹ تو شائع کر دی لیکن مسٹر مسعود کی رپورٹ کو دبایا۔ یہ کچھ ۱۹۴۸ء میں ساری جہذب دنیا کے علی الرغم کیا گیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر مسعود کی اختلافی رپورٹ میں کیا لکھا ہے لیکن قرآن سے اس کے متعلق تیس لگانے میں چنداں مشکل نہیں۔ مسٹر مسعود کا قلبی احساس اور ذہنی افتاد ہمارے سامنے ہے۔ ان کی زندگی کے سابقہ رجحانات اور ان کے علی تجارب کے کچھ نفوش بھی گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں (آپ نے اب محسوس کیا ہوگا کہ ہم نے مسٹر مسعود کے سابقہ زندگی کے احوال و کوائف کا بیان کیوں ضروری سمجھا تھا)۔ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہاریوں اور زمینداروں کے حالات کے متعلق مسٹر مسعود کو براہ راست معلومات حاصل ہیں اس لئے کہ وہ ایک عرصت تک اندرون سندھ میں بہ حیثیت کلکٹر کام کرتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ ہنہا جرن کے بسانے کے کام پر مامور ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ سندھ کا زمینداری نظام، اس مسئلہ کو کس طرح لایخیل بنا رہا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں مسٹر مسعود کی اختلافی رپورٹ کے متعلق صحیح اندازہ لگانے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رپورٹ میں ہاریوں کی مظلومیت اور زمینداروں کے باؤ سبباً نہ چنہ استبداد کی گلوگیروں کو بے نقاب کیا گیا اور قرآن اور حکمت کے نصوص و خواہد سے زمین پر انفرادی اور شخصی ملکیت کا عدم جواز ثابت کیا گیا ہوگا۔ (کہ جس مسعود سے راقم الحروف اس کے زمانہ طالب علمی سے واقف ہے اس سے اس کے سوا کچھ اور توقع ہی نہیں کی جاسکتی)۔ لہذا ہمارے نزدیک یہ مسئلہ مسعود اور سر راجر اس یا حکومت سندھ کا مسئلہ نہیں۔ یہ مسئلہ وہی جو جو ہابیل اور قابیل کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ یہ صدائے بازگشت ہے، اس داستان کہن کی کہ جب ساحرین دہبار فرعون نے حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ کر کہہ دیا کہ انا برب العالمین۔ ہم خدائے رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں تو فرعون ایک بھڑے ہوئے شیر کی طرح گر جا اور کھت بدھاں سیلاب کی طرح اٹا اور تہرانیت کی برقی طاقت کی کسی گرج کے ساتھ چلایا کہ امنتہم بہ قبل ان اذن لکم۔ میری اجازت کے بغیر تم ایمان لا رہے ہو جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لا قطعن ایدیکم وارجدکم من خلاف ثم لا صلیبکم اجمعین (۱۱۱) میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اٹھے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر رب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ ولتعلنن اینا اشد عذابا و ابغی۔ اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب زیادہ خراب اور دیر پا ہے۔ انا برب العالمین اور حق گوئی اور بے باکی کی وہی ازلی آویزش جو وہاں فرعون اور ساحرین کی کشمکش کی صورت میں تشکل ہوئی تھی۔ یہاں ارباب اقتدار سندھ اور مسعود کی آویزش کی شکل میں مشہور ہوئی ہے۔

دستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریتِ پنجہ شکن نئے

وہی فطرتِ اسدِ اللہی - وہی مرجی وہی عنتری

واقع رہے کہ مسعود سے ہماری مزاحمتیں اللہ پاک کے غلام جیلانی کے خلف الصدق اور سندھ کے آئی۔ سی۔ ایس۔ افسر سے نہیں بلکہ مفہوم ہے حق و صداقت کی اس آواز سے جو مظلوم انسانیت کے دکھ سے ماتم ہو کر ایک نوجوان مسلم کے سینہ میں برقِ نیاں بن کر دوڑی اور در عبدالرحمن بن کر گرجی۔ لہذا یہ مسئلہ اب مٹ سکتا اور رباب بست و کشاد سندھ کا نہیں رہا بلکہ سوال ہو گیا ہے حق و انصاف کی حمایت میں آواز بلند کرنے والی سیدہ رحمت اور جہدِ استبداد کے بیچہ آہنی سے اس آواز کو دبانے والے طاغوتی گردہ کا۔ ہم پوچھتے ہیں حق و صداقت کی تائید کے نعروں سے کیا تمہاری موجودگی میں استبداد کا قہر بانی پنجہ بھی کچھ کرتا رہے گا! کیا مظلوم انسانوں کی حمایت میں کھلی ہوئی آواز کو آہنی بھی اجازت نہ مل سکے گی کہ وہ درد آشنائیوں کے کانوں تک پہنچ سکے! ہم پاکستان کے پردیس سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ استبداد کے اس چیلنج کو یونہی بلا استجاب چھوڑ دینگے؟ اس وقت حریت و صداقت اور مظلوم انسانیت آپ کا منگ رہی ہے۔ اور ہم گزارش کریں گے حکومت پاکستان کے اربابِ صل و عقد سے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت کا احساس کریں اور اس سوال کو مہر کترا اور صوبہ کے دوائر عمل کے اصطلاحی نقاب سے اوجھل کر کے اپنے آپ کو مطمئن نہ کر لیں۔ زمیندار اور کاشتکار کا یہ عقدہ اب اس حد تک پہنچا ہے کہ اگر آپ کے ناخن تندرینے اس کی گرہ کشائی نہ کی تو کمیونزم کا شعلہ جوالہ اس پر پیکا اور نعلوم اس کے ساتھ کیا کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا!

باقی رہے مسعود صاحب۔ تو ہم بہ صریح قلب انہیں مستحق ہزار تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کے باوجود اس طرح کی بے باکانہ حق گوئی سے اس سیرتِ یوسفی کی یاد تازہ کرا دی جہاں قید خانہ کی سلاخوں کے پیچھے ایک خود آگاہ و خدا مست آواز نے کیا تھا کہ یصاحی السجن مار بآب متفرقون خیرام اللہ الواحد القہار۔ اسے میرے قید خانہ کے ساتھیوں! کیا یہ ارباب متفرق اچھے ہیں یا خدا ہے واحد و قہار! ہو سکتا ہے کہ اس حق گوئی کے جوم کی پاداش میں، مٹ سکتا ہو انہوں میں سے بھی گزرا ہو۔ لیکن ہم پوری امید ہے کہ ایسی صورت میں ان کا جواب بھی وہی ہوگا جو ساحرین فرعون نے فرعون کی دھمکی کے جواب میں دیا تھا کہ فاقض ما انت قاض۔ جو تیرے جی میں آئے کر گذر۔ انما تفضیٰ ہذاہ الحیوۃ الدنیاء۔ تمہارا حکم اسی جہاں آب و گل کی چار دیواری تک محدود ہے اور زندگی کی فضائیں لاتناہی ہیں۔ ان تک تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی۔

بہتر اندازِ زندگی سے سو فیاد ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں پر زندگی!

ہوتے ہیں کہ ان کی تسکین، خرفہ انسانیت کے نمودار تغار کی راہ میں حاصل ہونے کی بجائے اس کے عروج و ارتفاع کے لئے 'مدد و معاون' بنتی ہے۔

لیکن تذکرہ صدر طبقات سے کہیں زیادہ تعجب انگیز اور افسوسناک روش ہمارے ارباب اقتدار و اختیار کا ہے جنہوں نے آج تک محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ اُس کے طوفان بلا انگیز کو کس شد و بد کے ساتھ دعوتِ استیلا دے رہے ہیں۔ پاکستان میں مغرب اور امرِ طبقات میں تفریق و تمیز اور عوام اور حکمران طبقہ میں بعد و مغائرت اس درجہ نمایاں اور شدید ہو چکی ہے کہ اگر اس کے حقیقی ازالہ کی جلد کوشش نہ کی گئی تو یہ لاوا کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ ہم اس خلا کی طرف جو عوام اور حکومت میں پیدا ہو چکا ہے مسلسل ایک سال سے توجہ دلاتے چلے آ رہے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کے پُر کرنے کی کوئی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی۔ ہم ایک بار اپنے ارباب اختیار کو پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں بعینہ وہ حالات پیدا ہو رہے ہیں جن سے کیونزم کی تخریبی قوتیں بڑا فائدہ اٹھا جا یا کرتی ہیں۔ بسوں کے کی تسکین تصور حیات اور اصول زندگی کے وعظوں سے نہیں ہوا کرتی۔ عملی اقدام سے ہوا کرتی ہے اور یاد رکھئے کہ یہاں جس قسم کی طبقاتی تقسیم پیدا ہو چکی ہے وہ ان وعظوں کی عملی تفلیط و تفصیح کے لئے کسی خارجی سہارے یا انگینت کی بھی محتاج نہیں۔ *وفی انفسکم اذلا متصرون؟* — طلوع اسلام [

لمعات

(بقیہ مضمون از صفحہ ۸)

حال ہی میں راشٹریہ سیکرنگ نے حکومت ہند کو دھمکی دی تھی کہ وہ یا تو پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے یا پھر ان پر سے پابندی ہٹائے۔ اس مطالبہ کی عدم منظوری سے سنگھ نے سول نا فرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ ۲۱ جنوری کو وہ تحریک غیر مشروط طور پر واپس لے لی گئی ہے۔ کیا سنگھ کو حکومت ہند کے عزائم کا پتہ چل گیا ہے اور انھیں اطمینان ہو گیا ہے؟

ہمارے خدشات و اہم کی تخلیق نہیں۔ خود ہندوستان کی حرکات ایسے خدشات کو تقویت دے رہی ہیں۔ ۵ جنوری کی قرارداد اخبارات میں شائع ہوئی تو اس سے متعلقہ دستاویزات ایسی و تشریحات جو کمیشن نے پاکستان اور ہندوستان کو ہم سنبھالیں اشاعت کے لئے نہیں دی گئی تھیں اور خیال تھا کہ وہ بعد میں سوزوں وقت شائع کی جائیں گی۔ اس اخلاقی پابندی کے باوجود ہندوستان کی طرف سے نہرو کی رو یادداشتیں اخبارات میں بلا اجازت چھپ گئیں۔ حیران کن امر یہ ہے کہ ۲۳ جنوری کو یہ یادداشتیں مداس کے روزنامہ ہندوستان

شائع کیں اور دوسرے دن انھیں حکومت ہندوستان نے باقاعدہ اشاعت کے لئے دیدیا۔ ان یادداشتوں میں کوئی غیر معمولی فیصلہ نہیں تھا جس کی اشاعت سے خاص مقصد حاصل ہوتا جو باحکومت ہندوستان کو کسی قسم کا فائدہ پہنچاتا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہرو صاحب اکیلے بیٹھے ہوئے بلند آواز سے بائیں کر رہے ہیں اور انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سامنے ڈاکٹور لوز انبیٹے ہیں۔ لیکن یہ بنا اجازت اشاعت ہے وجہ نہیں ہو سکتی۔ کم از کم یہ خلاف عہد ہے اور آئندہ اس ذمیت سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ان یادداشتوں میں البتہ یہ امور قابل ذکر ہیں:-

۱) مشر نہرو نے بہت زور صرف کر کے یہ ثابت کیا کہ استصواب ناقابل عمل ہے، لہذا کوئی متبادل صورت تلاش کرنی چاہئے۔

۲) آزاد کشمیر کی فوجوں کو منتشر کرنے کے بعد ریاست میں ہی رہنے دیا گیا تو استصواب آزادانہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کی موجودگی ان عناصر کو پریشان کرے گی جو اہل حق پاکستان کے خلاف ہوں گے۔

۳) اس سوال کا فیصلہ کہ باہر سے آنے والے بائزر ضرورت کے لئے آئے ہیں یا نہیں ریاست جموں و کشمیر کی حکومت کو کرنا چاہئے۔

۴) جب تک پاکستان اپنا معاہدہ پورا نہ کرے اس وقت تک ہندوستان پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ڈالنی چاہئے۔

۵) چونکہ ریاست میں ہزاروں آدمیوں کو واپس لانا ہوا اس لئے استصواب کے انتظامات جلدی عمل نہیں ہو سکتے۔

یہ وہ نتیجعات ہیں جو ذریعہ علم ہندوستان کی اختراعات و باخ ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ پاکستان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ خود کشین نے انھیں تسلیم نہیں کیا۔ کم از کم یادداشتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا۔ نیز جو وعدہ دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ان کے خلاف ہیں۔ اگر ان یادداشتوں کی حیثیت یہی کچھ ہے تو ان کی اشاعت کی سچی عیبت کیوں؟ عین ممکن ہے کہ قوی اندرونی عناصر کو جو استصواب کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں، خاموش کرنے کے لئے حکومت ہندوستان نے اپنی ذہنی رو کو بے نقاب کرنا مناسب سمجھا ہو تاکہ وہ یہ جانپ جائیں کہ حکومت نے استصواب کا فیصلہ پونہ نہیں مانا۔ بلکہ وہ اسے ناقابل عمل سمجھتی ہے اور ناقابل عمل بننے کے رہ گئی، یا ناقابل عمل نہ بنا سکی تو مشکلات کھڑی کر کے اسے اتوار میں ڈالتی جائے گی۔ اتوار فیض ہو سکتا ہے، کیونکہ جب بھی عسکری نقطہ نگاہ سے سازگار فیصلہ پایا ہوئی عہد توڑ کر طرح جنگ ڈالی جا سکتی ہے۔ ہندوستان بیرون ملک پر دوہینڈہ کے لئے امن پسند اور غیر جنگجو ہونے کا دعویٰ باندھ رہا ہے، اولاً ہندوستان ملک وہ مختلف اعزاز سے باخ رہا ہے۔ یہ قضا کی دقت ہے، ہر زمانہ ٹوڑنے کا باعث بن سکتا ہے۔ یوں ہی ہندوستان کے متعلق ایسا عہد کا تجربہ خوشگوار نہیں۔ وہ روبرو بہت سے وعدے کر لیتا ہے، مگر ایفاریں ہزار جنس میں پیش کرتا ہے اور حیلے تراشتا ہے۔ کشمیر کے معاملہ میں اسے ذمیل نہیں دی جا سکتی۔ یہ لیکن مسئلہ ہے اور اس کے تباہ کن نتائج ہو سکتے ہیں!

استصواب کی تیاری کے لئے تحریر و تقریر کی آزادی از بسکہ فردی ہے، نیز ہر قسم کی غیر آئینی پابندیاں جو ڈیڑھ راج کا طغرانہ امتیاز ہیں یکے قلم کا عدم ہوجانی چاہئیں۔ یہ غنیمت ہے کہ کمیشن نے اس کے لئے مناسب گنجائش رکھ دی ہے۔ لیکن عملاً اس شرط کو ناکارہ بنایا جاسکتا ہے، اور فریق ثانی جس قسم کی حرکات مذکورہ کا مظاہرہ کر رہا ہے اس سے یہ بعید بھی نہیں۔ لہذا یہ احتیاط بھی بہتر ہی ہوگی کہ فریق ثانی کوئی ایسا اقدام نہ کرے اور اگر وہ کرے تو اس کا مناسب تدارک ہو سکے۔

استصواب کے سلسلہ میں، یکہ اہم امر کو ہم سمجھنا نہیں چاہتے۔ محض سمجھنا نہیں بلکہ اسے خصوصیت سے اجملنا چاہئے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہزاروں کشمیری مسلمان تہ تیغ کئے جا چکے ہیں، اور ہزاروں گھربار چھوڑ دینے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان سے کثیر تعداد میں غیر مسلم کشمیر میں بسائے جا چکے ہیں۔ اس سے رائے شماری پر لامحالہ اثر پڑے گا۔ اس کے علاوہ عام طور پر پیر و پیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جموں کے علاقہ میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اس غلط مفروضہ سے تقسیم کشمیر کا مردود سوال بھی بعض ذہنوں میں آنا شروع ہو گیا۔ یہ غنیمت ہے کہ شائع شدہ دستاویزات میں تقسیم کا کہیں ذکر نہیں۔ استصواب میں ریاست کو ایک کل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان نے مشکلات پیدا کر دیں اور اسے ناقابل تسلیم کرنے کے مذہب و ارادے سے تائید پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو کسی مرحلہ پر تقسیم کا فتنہ سر اٹھا سکتا ہے۔ بین الاقوامی ثالث اپنی نجات اسی میں سمجھیں گے کہ وہ تقسیم کرا کے ہی اس خارتار سے نکل جائیں۔ اندر میں حالات یہ فردی معلوم ہونے لگے کہ کشمیر کی مردم شماری کے صحیح اعداد و شمار عام طور پر شائع کئے جائیں تاکہ کوئی متعلقہ شخص اس سے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ آخری مردم شماری سلسلہ میں ہوئی تھی۔ اس کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں۔ واضح رہے کہ کشمیر تین انتظامی حصوں میں تقسیم ہے۔

کل آبادی	مسلمان	غیر مسلمان
صوبہ جموں ۲۳۳ ۸۱۹	۱۲ ۱۵ ۶۷۶	۷ ۶۵ ۷۵۷
صوبہ کشمیر ۷۰۵ ۲۸۸	۱۶ ۱۵ ۴۷۸	۹ ۱۳ ۲۲۷
صوبہ سرحد ۴۷۸ ۱۱۳	۲ ۷ ۰۹۳	۴ ۱۰ ۳۸۵
۶۱۶ ۲۲۲ ۳۰۰	۳۱۵ ۱۰ ۲۴۷	۹ ۲۰ ۳۲۹

یہ اعداد و شمار اس مردم شماری کے ہیں جو حکومت ہند کے زیر نگرانی ہوئی تھی اور جس کے ریکارڈ اس کے ہاں محفوظ بھی ہیں۔ یہی آخری مردم شماری ہے اور اسی کو استصواب کی رائے شماری کی اساس ہونا چاہئے۔ ہم بھردہ مہراتے ہیں کہ التو اسے جنگ بجائے خود کامیابی ہے لیکن یہی کامیابی نہیں۔ اصلی کامیابی استصواب کی کامیابی ہے اور اس کی جنگ ہنوز شروع نہیں ہوئی۔ کہا نہیں جاسکتا کہ اس وقت تک مذاکرات کیا رنگ اور مسائل کیا نوعیت اختیار کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک طرف استصواب کی تیاری پوری مستعدی سے کرنی چاہئے اور

دوسری طرف اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ بظاہر امن کی فضا خوفناک تریجنگ کا پیش خمیہ ہو سکتی ہے۔ اگر فریق ثانی امن و صلح پر مصمم قلب آ رہا ہے تو ہم امن کے جملہ تقاضے پورے کریں گے اور اگر وہ نقص امن کرنا چاہتا ہے تو ہمیں غافل نہیں رہنا چاہئے۔

کشمیر کی کثرت آبادی مسلمان ہے اور یہ آسانی فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان سے ہی الحاق پسند کریگی۔ یہ مفروضہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشندگان کشمیر کے مسلمان ہونے پر ہی غیر مسلمی اعتماد کو بے بلکہ عمل سے بتائے کہ وہ پاکستان میں محفوظ و خوشحال ہوں گے۔ اور ان کے دور غلامی و ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ابھی تک پاکستان نے پاکستانی ریاستوں کے نظام میں خاطر خواہ طریقہ سے اصلاح نہیں کی۔ خود پاکستانی عوام ارباب حکومت سے کما حقہ مطمئن نہیں۔ عمل کی ایسی الفاظ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر پاکستان اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ پاکستان اور پاکستانی ریاستوں میں عوام کا درجہ بلند ہوگا اور انسانی حقوق کا کما حقہ تحفظ ہوگا تو اس عملی مثال کا مسلمان کشمیر پر پتہ اچھا اثر پڑے گا۔ وہ خود بخود کچھ چلے آئیں گے۔ استصواب کے انعقاد میں کافی دیر ہے اور اس وقت میں پاکستان کے پاس سہری موقع ہے کہ وہ نظم و نسق میں اس بیج کی اصلاح کرے کہ استصواب میں رائے دینے والے مجبور ہو جائیں کہ پاکستان سے ہی الحاق کریں۔

انتخابات پنجاب

پنجاب کی ریاست قومی اعتبار سے ۱۹۷۳ء سے ہی کہ اصلاحات ۱۹۷۳ء کے مطابق پہلی نمائندہ ذرائعوں نے صوبائی نظم و نسق سنبھالا ایسی بیج پر چلنا شروع ہوگی تھی کہ صوبائی ترقی اور

عوامی ترقیح کیلئے وہ چنداں خوش آئند نہیں تھی۔ حضور وزارت کے برس اقتدار آنے سے اس بیج میں تو کیا تبدیلی واقع ہوتی اور یہ نظم و نسق حکومت کا پہلا وقار بھی ضائع ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جب صوبائی عنان اقتدار نمائندگان مسلم لیگ بلکہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر خان ممدوٹ، اور ان کے رفقاء لیگ کے سپرد ہوئی تو صوبائی نظم و نسق بازی گاہ طفلان بن کے رہ گیا اس وزارت نے انتظام حکومت کو اس قدر فاسد و مسموم بنا دیا کہ فساد و مسموم کی اس سے بدتر مثال شاید ہی ڈھونڈنے سے مل سکے۔ ہم نے اشاعت جزیری میں اس فساد عظیم پر تبصرہ کرتے ہوئے مرکز سے مطالبہ کیا تھا کہ وزارت اور اسمبلی دونوں کو توڑ دیا جائے اور صوبائی نظم و نسق گورنر کو سونپ دیا جائے۔ اس تحریر کی روشنائی بشکل ختم صوبائی تھی کہ مرکز نے عوامی فریاد کو سن لیا اور ان کی مدد کو آ پہنچا۔ چنانچہ مغربی پنجاب کی وزارت اور مجلس مقننہ کو گورنر کے انصرام حکومت گورنر کو سونپ دیا گیا۔ گورنر راج اس وقت تک باقی رہے گا جب تک نئے انتخابات نہیں ہو جاتے اور گورنر آئینی ذمہ و مقرریں کر لیتا۔ ہم گورنر جنرل کی خدمت میں اس جرات اقدام پر مدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے صوبہ بھر کو ایک نعمت سے نجات دلا دی ہے۔

صدر و وزارت کا کم و بیش اٹھارہ مہینوں کا ننگ صوبہ، ننگ وطن اور ننگ سیاست دور آفر کا ختم ہوا۔ اشارہ قومی مہینوں میں مغربی پنجاب اور پاکستان کی پیشی بااختیار سر انجام دی جا سکتی تھیں، لیکن یہ جمہوری نام نہاد مفاد ملت کو سہا پست ڈال کر شخصی تصدق اور ذاتی غلبہ کے تحفظ و بقا کی سازشوں میں الجھے رہے۔ یہ طائفہ خدا کا

جسے مسلمان پنجاب نے زندہ باد کے نکلے لگا لگا کر اپنا واحد نمائندہ بنایا تھا ان پر کاہوس بن کر مسلط ہو گیا۔ مقام اتمان ہے کہ صوبہ کو اس کاہوس سے نجات مل گئی ہے اور قدرت نے اہل پنجاب کو سنہری موقع عطا کیا ہے کہ وہ صوبہ کی عنان قیادت حسب خواہ بدل لیں۔ لیکن پنجاب کے ووٹروں کو جہاں یہ سنہری موقع عطا ہوا ہے وہاں ان پر ایک نازک ذمہ داری بھی آپڑی ہے۔ راندہ وزارت کے خلاف ان کی شکایات مسلم لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ انہی کے ووٹروں سے صوبہ پر مسلط ہوئی تھی۔ لہذا اب نہ محض ان آزمائے اور ٹھکرائے ہوؤں کو پھر سے سناہد اقتدار پر مسلط نہ ہونے دیا جائے بلکہ آئندہ کے لئے ان کو منتخب کیا جائے جو جذبات خدمت سے سرشار ہوں اور دولت عمل سے مالا مال۔

دوٹ ایک قیمتی متاع ہے۔ ملک و ملت کا مستقبل اس کے طریق استعمال سے وابستہ ہے۔ آپ کے پاس کافی دقت ہے۔ گرد و پیش نگاہ دوٹائیے۔ ان مردان جفاکش کو تلاش کیجئے اور ابھاریئے جو جو وجود جہد و جدوجہد کے سنگین تقاضوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے صوبے کا نظم و نسق فساد سے پاک رہے تو ان کے حق میں دوٹ دیکھئے جو آپ کے حیات و خیمات کی نماندگی کریں نہ کہ ان کے حق میں جو آپ پر حکومت کرنے میں سامعی رہیں۔

ووٹروں کے بعد ہماری عرض مسلم لیگ ہے۔ جن ارکان وزارت اور ارکان مجلس مقصد کو ترجیح دیکھ جینی دو گوش نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی کامیابی پر مسلم لیگ نے فتح کے شادیانے بجائے تھے اگر ان کی کامیابی مسلم لیگ کی کامیابی تھی تو ان کی ناکامی اور نامرادی بھی مسلم لیگ کی ناکامی اور نامرادی ہے۔ رافضیہ مقصد میں مسلم لیگ قدیم کے ہی نمائندگان نہیں تھے بلکہ اس میں مسلم لیگ جدید کے تو منتخب ارکان بھی تھے۔ دونوں نے جو مظاہر کیا وہ شرمناک داستان ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اور وہ ان سے کیسے عہدہ برآ ہوگی؟ کیا وہ بدستور سابق اپنے نامزدگان کو مختلف حلقوں سے کھڑا کرے گی؟ اس وقت مسلم لیگ کے علاوہ کوئی سیاسی پارٹی میدان میں نہیں۔ ہمیں کہا جاسکتا کہ انتخابات کے اعلان سے نئی پارٹیاں معرض وجود میں آجائیں گی یا نہیں۔ اگر کوئی نئی پارٹی بن بھی جائے تو اس کے پاس فضا ساڑھا کر کرنے کیلئے مطلوبہ وقت نہیں ہوگا۔ اس لئے بظاہر نئی سیاسی پارٹیوں کا قافیہ تنگ نظر آتا ہے۔ اگر اس صورت میں مسلم لیگ نے نامزدگیوں سے کام لیا تو انتخابات نامزدگیوں سے زیادہ واقع نہیں ہوں گے۔ چونکہ مسلم لیگ کا حریف کوئی نہیں ہوگا۔ لہذا جسے بھی مسلم لیگ نامزد کر دے گی وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیگا۔ اسی اشاعت میں دوسری جگہ ہم نے بتایا ہے کہ مسلم لیگ کی تنظیم جدید خاطر خواہ نہیں ہوئی اور بہت سے اصحاب غرض و ابائے وقت نے اس کی ہر دو اعززی کے دامن میں پناہ مانے لی۔ ہر اندر یہ حالات ملت ایک نااہل اور غرض پرست گروہ چھٹکارا حاصل کر کے دوسرے نااہل اور غرض پرست گروہ کے چکل میں پھنس جائیگی اور قوم کا اہل طبقہ منظر عام پر نہیں آسکے گا۔ لہذا مسلم لیگ سے ہماری یہ درخواست ہے کہ مغربی پنجاب کے انتخابات کو ایک پارٹی کے انتخابات کا تاثر نہ بناوے۔ بالفاظ صحیح ترہ انتخابات کسی